پندرہ روزہ

چنگاری

دہلی

اگست ۱۹۸۳ء

(نصف اوّل)

قیمت دو روپئے

- عصمت چغتائی کا خط راہی معصوم رضا کے نام
- فکر تونسوی سے ملاقات اور تخلیقات
- کنہیا لال کپور کا غیر مطبوعہ مضمون
- خواجہ عبدالغفور کا مُلّا دوپیازہ
- اور افسانے • نظمیں • غزلیں • تبصرے

پندرہ روزہ
چنگاری دہلی

ایڈیٹر:
جمیلہ احمد
ادبی حصے کی ترتیب
بشیر احمد
انیس احمد خاں
شمارہ نمبر ـــــ ۲۳
قیمت: ۲ روپئے ـــــ سالانہ: ۴۵ روپئے
پتہ: ۳/ ۱۰/۱۴ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

جمیلہ احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے جے کے آفسٹ پرنٹرس جامع مسجد دہلی سے چھپوا کر ۳/ ۱۰/۱۴ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲ سے شائع کیا ۔

آزادی کے داغ داغ اُجالا کے بعد فنون اور فنکاروں کی جس طرح بے قدری ہوئی اور خاص طور پر اپنے آپ میں مگن رہنے والے فن کاروں کو جس طرح نظر انداز کیا گیا وہ کسی بھی معاشرے کے لئے شرم ناک ہے۔

اس رویئے سے سب سے زیادہ نقصان اردو قلمکاروں کو ہوا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خسارہ معاشرے کو ہوا۔ اس لئے کہ جو معاشرہ اپنے فن کاروں اور فنوں کی قدر نہیں کرتا وہاں وحشت، بربریت، تنگ نظری، منافرت، بازاریت اور مشینیت کا غلبہ ہو جاتا ہے اور انسان کی اعلیٰ قدریں جو اسے وحشی سے ممیز کرتی ہیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ انسان مشین کا پرزہ بن جاتا ہے۔ اور ذہنی تناؤ اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

چنگاری اپنے قاری کا نہ صرف ذہنی تناؤ کم کرتا ہے بلکہ اس کی اعلیٰ قدروں کو بیدار کر کے فنون لطیفہ اور فن کاروں خاص طور پر قلم کاروں کو معاشرے میں مستحق مقام دلانے کے لئے بھی کوشش کرتا ہے۔

• مگر یہ آپ کے تعاون سے ہی ممکن ہے

اس شمارے میں

دامن نگاہ کا	خطوط	۲
نقد جان		
ایک خط	عصمت چغتائی	۳
مقابل ہے آئینہ		
فکر کا انٹرویو تونسوی سے	فکر تونسوی	۴
فکر تونسوی کا کچا چٹھا	فکر تونسوی	۶
مجرم (نظم)	فکر تونسوی	۷
آدمی نامہ، آخری غزل	فکر تونسوی	۸
فکر تونسوی میری نظر میں	کنھیا لال کپور	۹
سب سے زیادہ لکھنے والا	نریندر لوتھر	۱۰
ملا دو پیازہ	خواجہ عبدالغفور	۱۳
میرے انتقال کے بعد	فکر تونسوی	۱۵
ساز سخن		
سقراط بڑا خوش قسمت تھا۔	کرشن موہن	۱۸
اب	"	۱۸
حدیثِ دل		
سلطان اختر		۱۹
ڈاکٹر ابو محمد سحر، فرحت قادری، سیدہ فرحت، مختار شمیم		۲۰
عالم خورشید، جمیل قریشی، قاضی انصار، رؤف خیر، شبیر احمد قرار		۲۱
بھرت جی، انعام الحق، شمس تبریزی، بی، ایل لبنت، طلحہ تابش		۲۲
بزم ہستی		
آگ	محمد طارق	۲۳
کچھ پوچھ نہ مجبوری	سرسوتی سرن کیف	۲۴
خاموشی	قاسم خورشید	۲۸
مانگے کا اُجالا		
فلمی دنیا کی کہانی	شاہنواز کی زبانی	۲۹
سخن در سخن	خامہ بگوش	۳۵
تجربے کی زبان		
کتابوں کی باتیں	ب - ا	۳۸

پندرہ روزہ "چنگاری" متواتر موصول ہو رہا ہے، اس عنایتِ خاص کے لئے بے حد ممنون ہوں۔ کافی دنوں کے بعد اتنا صاف ستھرا ادبی پرچہ دیکھنے کو ملا، طبیعت خوش ہو گئی۔ سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں برِّ صغیر کے کئی ممتاز و معتبر فن کاروں کا تعاون آپ کو حاصل ہو گیا جس کی بنا پر پرچہ کافی وقیع اور جاندار ہو گیا ہے۔ مزید برآں پرچہ کا حسنِ ترتیب اس بات کا غماز ہے کہ آپ کافی لگن، محنت اور جاں فشانی سے کام لے رہی ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ "چنگاری" کو پندرہ روزہ کے بجائے اگر ماہنامہ کر دیا جائے تو آپ مزید توجہ اور سہولت سے کام کر سکتی ہیں۔ یہ بات آپ کے علاوہ قارئین کے بھی حق میں جاتی ہے۔

غزل نمبر کا اعلان تشویش ناک حد تک مسرور کن ہے۔ آپ اتنی جلد جلد نمبر نہ نکالا کریں ورنہ حاسدوں کا تیا پانچہ ہو جائے گا۔

فرحت قادری

• • •

مارکس کی موت کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے اور مذہب آج تیسری دنیا میں ایک نئی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اسی لئے میں نے سوچا مذہب اور مارکسزم پر آج قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ امید ہے چنگاری کے قارئین کو یہ مضمون پسند آئے گا۔ اس پر اور لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مختصر سا مضمون میں نے قارئین کو سوچنے پر مجبور کرنے کے لئے لکھا ہے۔

اصغر علی انجینیر

• • •

"چنگاری" پسند آ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے سال بھر بھی اس کی طرف خصوصی توجہ دی تو یہ صحیح ادب کا سب سے نمایاں اور نمائندہ رسالہ بن جائے گا۔

حلقۂ احباب میں چنگاری اور آپ کے خط کا تذکرہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سب لوگ آپ کو تخلیقی سطح پر بھرپور تعاون دیں گے۔

شوکت حیات

• • •

چنگاری کا شمارہ نمبر ۱۹ دیکھا پسند آیا بلکہ یوں کہوں کہ خرید کر بغور مطالعہ کیا تو اچھا ہے۔ اس شمارے کے تمام مضامین افسانے اور شعری نگارشات مقصدی معلوماتی اور اعلیٰ معیار کی ہیں۔ سرورق دیدہ زیب اور کتابت و طباعت نفیس۔

فردوس گیاوی

• • •

"چنگاری" کا ہر شمارہ پابندیٔ وقت سے مل رہا ہے۔ اتنا اچھا رسالہ نکالنے کے لئے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

تازہ شمارہ میں امرتا پریتم سے متعلق جو کچھ بھی شامل ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

نسیم محمد جان، فاروق راہب اور مجتبیٰ حسین کی تخلیقات معیاری لگیں۔ محسن زیدی پر حسن نعیم، شہریار، اقبال ساجد، اجمل اجملی اور محمود سعیدی نے جو تاثرات پیش کئے ہیں اس سے محسن زیدی کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور یہ بلاشبہ اہم کام ہوا ہے۔ میرے لئے کوئی خدمت؟

قاسم خورشید

• • •

بے حد خوشی ہوئی کہ اس جریدہ میں وہ تمام خوبی پائی جاتی ہے جو ایک معیاری جریدہ میں ہونی چاہیئے۔ سرورق جاذبِ نظر اور دل کش ہے ایک تجزیہ میں "فلسطینی انقلاب کا نیا چہرہ" کے مطالعہ کرنے سے فلسطینی عوام کی زندگی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح "ارنلڈ ٹوائن بی" کا مضمون "یہودی ریاست اور فلسطین" کے مطالعہ سے یہودیوں کا سلوک بے نقاب ہو جاتا ہے۔ "جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے" ایک حقیقت کی ترجمانی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی تحریر "خانہ بدوش" بڑی ہی مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہے۔ نظم "محبت اور پٹرولیم" فلسطینی عوام پر، یہودیوں کے ظلم و ستم ڈھانے کا ذمہ دار عربوں کو سمجھتی ہے۔ "فیض احمد فیض سے ملاقات" جناب شفیع عقیل صاحب ہی نے نہیں کیا بلکہ قارئین کو بھی یہ نعمت بخشی ہے "میری شاعری کی عورت" موجودہ ادبی ماحول کے منظر اور پسِ منظر سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ افسانہ "دشنامت" میں خوابناکی بھی ہے اور حقیقت کی عکاسی بھی "سیاہی کی سرگزشت" پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ ہمارے مسائل آج کے مسائل کی غمازی کرتے ہیں۔ غزلوں میں حسن نعیم، ضیا فتح آبادی انور مینائی خاص طور سے پسند آئے۔

انجان علیم

• • •

"چنگاری" پابندی سے آنے لگا ہے۔ "چنگاری کالم نگاری نمبر" کا بے چینی سے انتظار ہے۔ برائے مہربانی رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوائیے گا۔ "چنگاری" بے حد پسند آیا۔ بہت ہی جاندار رسالہ ہے۔ لاہور کے "نصرت" کی اس نے یاد تازہ کر دی۔ شروع سے آخر تک انتہائی زوردار ہوتا ہے۔

احمد جمال پاشا

• • •

چند دنوں قبل کالج کے پتے پر چنگاری کا ایک شمارہ دستیاب ہوا۔ اس سے قبل آپ نے ایک دو شمارے دہلی میں ملاقات کے دوران عنایت فرمائے تھے۔ ان عنایتوں کے لیے بے حد شکر گزار ہوں اور منتظر ہوں کہ آپ اس رسالے کے لیے کسی خدمت کا اہل مجھے بھی سمجھیں۔

ویسے رسالہ بہت خوب ہے اردو کے عام ادبی رسالوں سے الگ ہے۔ عام طور پر ہر چند غزلوں، ایک دو ادبی مقالوں اور چند افسانوں پر مشتمل جو ڈھانچہ اردو کے عام رسالوں کا بن گیا ہے اس سے باذوق اور باشعور قارئین کو اب الجھن سی ہونے لگی ہے۔ اس لیے زندگی اور سماج کے گوشوں کو چنگاری کے صفحات پر سمیٹنے کا جو عمل آپ نے شروع کیا ہے وہ آپ کی جدت طبع اور رسالے کی بقا کا ضامن ہے۔

اعجاز علی ارشد

ایک خط

عصمت چغتائی

عزیزم راہی۔

آپ واقعی بڑے معصوم ہیں کہ اتنا نہیں جانتے کہ ڈیموکریسی کی بقا کے لئے مذہب ذات پات کا اندراج بہت ضروری ہے۔ سرکار کو معلوم ہونا چاہئے کہ فرد کس مذہب، ذات اور صوبہ سے جڑا ہوا ہے۔ ہر ڈیموکریٹک ملک میں بچّے کی پیدائش کے وقت اس کے طلوع کی اطلاع میونسپلٹی میں دی جاتی ہے اور اُس فارم میں مذہب جائے پیدائش لکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

سب ہی ڈیموکریٹک ملکوں میں ذات پات مذہب رنگ کے انسانوں میں چپقلش جلتی رہتی ہے۔ یہ تو انگریز لائے، اس سے پہلے بچھڑے ہوئے ہندوستان میں ذات پات کا گھپلا چلتا تھا۔ ہندو مسلمان گڈمڈ ہو کر سیاسی لڑائیاں لڑتے تھے۔ جیتے ہارتے تھے۔

یورپ میں کیتھولک مذہب کا راج تھا۔ چرچ بادشاہ سے بھی زیادہ طاقتور تھا۔ کیونکہ اُسی مٹھی میں خدا کی مہربانی بھی شامل تھی۔ ہر ملک کا بادشاہ چرچ کے احکامات مانتا تھا۔ پھر ہنری دی ایٹتھ کی عاشق مزاجی نے پروٹسٹنٹ مذہب کو جنم دیا۔ کیتھولک مذہب میں ایک شادی سے زیادہ بیوی کی موجودگی میں کرنے کی اجازت نہیں، نہ ہی طلاق ہے۔ جدائی کی اجازت ہے۔ مگر دوسری شادی کی نہیں۔ ہنری نے کیتھولک چرچ سے رشتہ توڑ کر جی بھر کے شادیاں کیں اور طلاق بھی جائز بنا دی۔

عوام کو یہ قانون جی سے بھایا اور پروٹسٹنٹ مذہب چھا گیا۔

کتنی لڑائیاں مذہب کے نام پر لڑنے میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ جب عوام کو لڑا دیا جائے تو حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ دونوں کو لڑانے کے بڑے مفید نسخے ہاتھ آتے ہیں۔ سرمایہ دار بھی ایک طرح کا چھوٹا موٹا حاکم ہوتا ہے۔ وہ بھی فرقوں کو آپس میں ٹکرا کر منافع بڑھاتا ہے۔

جب ہی تو پیدائش کے وقت بچّے کا مذہب نوٹ کر لیا جاتا ہے۔ اور ہماری سرکار کو سب معلوم ہے کہ ملک میں کس صوبہ میں کتنے ہندو کتنے مسلمان اور کتنے دوسرے فرقہ کے انسان ہیں۔ اور وقت ضرورت یہ علم کام میں لایا جا سکتا ہے۔

انگریزی جنگ مذہب کو فراموش کر کے لڑی گئی اور انگریزی راج کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ مگر چلتے چلتے وہ آخری وار کرنے سے نہ چوکا، مذہب کا رجسٹر کام آیا اور ملک تقسیم ہو گیا۔ پتہ نہیں کم بخت آزادی کی اتنی کیا جلدی پڑی تھی کہ بوکھلا کر ہمارے لیڈروں نے ملک کے پرخچے اُڑانے پر رضامندی دے دی۔

انگریز کے زمانے میں جغرافیہ کی کلاس میں جو نقشہ ٹنگا ہوا تھا اُس کی کچھ اور ہی شکل تھی۔ میں ہمیشہ نقشہ کو اُلٹا کر کے دیکھا کرتی تھی۔ شری لنکا بڈھے کا سر لگتا تھا جو کمبل اوڑھے بیٹھا ہے۔ پر آج وہ نقشہ کچھ ننگا سا مُسکڑا سا لگتا ہے۔ برما شری لنکا، بھوٹان، نیپال، پاکستان، بنگلہ دیش مذہب کے نام پر کتر لئے گئے۔ یاد نہیں یہ کیسے ہوا۔ پاکستان تو مذہب کے نام پر بنا، شری لنکا کیوں ٹپک گیا۔ اور برما بھوٹان نیپال کدھر کٹ گئے۔ کشمیر بھی کٹ گیا۔

اس چیر پھاڑ کا نقصان ہندوستان سے زیادہ ان حصّوں کو ہوا جو کٹ گئے، مگر برطانیہ اور دوسری طاقتوں کو اُن حصّوں میں عمل دخل کا بہترین موقع ملا۔ ہندوستان ایک بوڑھا ملک ہے۔ دانش مندی میں یورپ اور امریکہ بہت پچھڑا ہوا تھا اور اب بھی ہے۔ حیوانی طاقت کے آگے دانش مندی نے ہمیشہ مار کھائی ہے۔ وحشی حملہ آور ہمیشہ دانش مندوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ عقل و دانش امن اور شانتی میں ڈبو دیتی ہیں۔ آپ مست ہاتھی اور تنومند شیر کو مہاتما بدھ اور مہاویر کی شانتی نہیں سمجھا سکتے۔

ہندوستان میں ہر مذہب کو خوش آمدید کہا۔ ہندو دھرم کا بغور مطالعہ کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب ہندو دھرم کے احاطے سے باہر نہیں۔ بدھ اور جین دھرم میں بھی دنیا کی دولت کے تیاگ کی تلقین ہے۔ یہ دونوں کمیونزم کے ابتدائی تصوّر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ اشتراکیت جو بجائے ہتھیاروں کے استعمال کے ذہنوں کی کایا پلٹ سے دنیا میں پھیلائی جا سکے۔ تیاگ کا پرچار، اُدھر یورپ اور امریکہ میں ڈھائی تین ہزار سال قبل انسان بندروں کی طرح پیڑوں پر رہتے تھے۔ آپس ہی میں لوٹ کھسوٹ مار پیٹ چلتی تھی۔

ہندوستان کو تو شائد یورپ و امریکہ کے وجود کا پتہ بھی نہ ہوگا۔ دو ہائی ہزار سال قبل۔ ایشیا ہی میں تعلقات بڑھے۔ فتوحات کے ارادے سے نہیں بلکہ بدھ دھرم کی تبلیغ کے سلسلہ میں۔ چین جاپان میں اِس مذہب کا بہت شاندار سواگت ہوا۔ بغاوت بھی تھوڑی بہت پھیلی، آپس میں لوٹ مار اور فتوحات کا سلسلہ نہیں پھیلا۔

ظاہر ہے خود ہندوستان میں تیاگ کو فروغ نہیں ملا۔ ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ جن کی پھوٹ نے مسلمانوں کو حکومت قائم کرنے میں مدد دی۔ اس وقت یورپ سے پرتگالی، اسپینی، فرانسیسی یہاں بیوپار کے سلسلہ میں آتے رہے اور آہستہ آہستہ یہاں کی پھوٹ نے ان کے پیر جمانے شروع کئے، اور اسی پھوٹ نے مسلمانوں کو انگریز کمپنی بہادر کو بندر بانٹ کا بلاوہ دے کر انگریز حکومت قائم کرنے میں مدد دی۔

انگریز نے فوراً پہلی بار ہندوستان میں مذہب کے نام پر بٹوارے شروع کئے۔ تب ہی شائد پیدائش کے وقت جنگی میں بچّہ کا نام اور مذہب درج کیا جانے لگا۔ اور یورپ کی مذہبی جنگوں کی بنیاد ڈالی گئی۔

پہلی بار جب پاسپورٹ کے لئے فارم بھرنا پڑا تو میں نے مذہب کے کالم کو غور سے دیکھا

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

فکر کا انٹرویو تونسوی سے

فکر تونسوی

(یہ انٹرویو روایتی بوسیدگی سے اُلجھنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس انٹرویو میں "میں" دو ہیں۔ ایک "میں" نے دوسرے "میں" کو اور دوسرے نے پہلے کو ننگا کرنے کی کوشش کی ہے۔ قارئین محسوس کریں گے۔ کہ دونوں ایک دوسرے کو ننگا نہیں کر پائے۔ شائد مصلحتیں سدِ راہ رہیں۔)

اس اعتبار سے اسے ایک ناکام انٹرویو بھی کہا جا سکتا ہے۔

تونسوی صاحب، فکر صاحب! آپ کا یومِ پیدائش کیا ہے۔ میرا مطلب ہے جس دن پیدا ہوئے تھے۔ اُس دن اگر پیدا نہ ہوتے۔ تو کیا فرق پڑتا۔

فکر صاحب، تونسوی صاحب! فرق یہ پڑتا کہ آپ فکر تونسوی کہلاتے، میں نہیں۔ اور میرا یومِ پیدائش کیا ہے۔ یہ میرا سر درد نہیں۔ محققین کا ہے۔ ایک محقق تحقیق کر کے بتلائے گا۔ کہ فکر تونسوی کا یومِ پیدائش ۷ / اکتوبر ۱۹۱۸ء ہے اور وہ میری اور دوسروں کی تحریروں سے ثبوت بھی پیش کرے گا۔ دوسرا محقق ارشاد کرے گا۔ کہ وہ ۷ / اکتوبر ۱۹۱۸ء کو نہیں بلکہ ۸ / اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ مصدقہ ذرائع ان کے پاس بھی موجود ہوں گے۔ اور پھر تیسرا محقق آئے گا، چوتھا، پانچواں۔ سبھی ثبوت ہائے گوناگوں لائیں گے۔ اور مجھے مختلف یومِ پیدائش پر پیدا کر کے دکھا دیں گے۔ لہٰذا اگر میں اپنا یومِ پیدائش بتا دوں۔ تو تحقیق کرنے والوں کے لئے کون سا کام باقی رہ جائے گا؟

تونسوی صاحب: کام کیوں نہیں رہے گا۔ مثلاً وہ تحقیق مزید کر کے ثابت کر دیں گے۔ کہ فکر صاحب نے اپنا جو یومِ پیدائش بتایا تھا۔ وہ بھی غلط تھا۔

فکر صاحب: بجا فرمایا آپ نے۔ نام غلط ہو سکتے ہیں تحقیق غلط نہیں ہو سکتی۔ اچھا حضور! یہ فرمایئے۔ کہ فکر تونسوی تو آپ کا اوریجنل اور پیدائشی نام نہیں ہے۔ آپ کا آبائی اسم شریف کیا تھا۔؟

تونسوی صاحب: دراصل میری پیدائش ہی بطور فکر تونسوی ہوئی تھی۔ مگر والد صاحب میری آنکھوں میں چمکتا ہوا فکر تونسوی نہیں دیکھ سکے۔ اس لئے اُنھوں نے میرا نام فتح چند رکھ دیا۔ فتح چند گاؤں کے پٹواری کا بھی نام تھا۔ جو گاؤں میں بطور ڈپٹی کمشنر حکم چلاتا تھا۔ اور والد صاحب اُس سے بہت نالاں تھے۔

فکر صاحب: گویا والد صاحب آپ کو پٹواری بنانا چاہتے تھے۔ مگر آپ طنز نگار بن گئے۔ وفادار اولاد کے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔

تونسوی صاحب: آپ احمقانہ سُوجھ بُوجھ کے مالک ہیں۔

فکر صاحب! پٹواری ہو یا ڈپٹی کمشنر۔ جو شر فا کا استحصال کرتے ہیں۔ طنز نگار بن کر ہی ان پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ والد صاحب پٹواری سے نالاں تھے۔ کیونکہ شرفا میں سے تھے۔ البتہ وہ نہیں جانتے تھے۔ کہ اگر میں پٹواری بن گیا۔ تو خود بھی استحصال کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں گا۔ کوئی پٹواری دوسرے پٹواری کے خلاف احتجاج نہیں کرتا۔ کوئی لٹیرا دوسرے لٹیرے کا تعاقب نہیں کرتا۔ بلکہ اب تو پولیس والے بھی اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ کیونکہ لٹیرا، بھاگ کر پولیس تھانے کی پناہ گاہ میں گھُس جاتا ہے۔ تھانہ، لٹیروں کا شرنارتھی کیمپ بن گیا ہے۔

لہٰذا میرے والد صاحب پٹواری سے نالاں تھے۔ لیکن جب میں فتح چند کی بجائے فکر تونسوی بن کر نمودار ہوا۔ تو پٹواری مجھ سے نالاں ہو گئے۔ والد صاحب اگر بے وقت انتقال نہ کر جاتے تو پٹواری کی گریہ وزاری دیکھ کر خوش ہو جاتے۔

فکر صاحب: آپ کسی بھی موضوع کو لٹکانے کا ہُنر خوب جانتے ہیں۔ ہے نا؟

تونسوی صاحب: میری بیوی کا بھی یہی خیال ہے۔

فکر صاحب: آپ کی سوچ میں بیوی کتنے فی صدی چھُپی ہوئی ہے۔

تونسوی صاحب: پوری فی صدی۔ میں تو کچھ بھی نہیں، صرف بیوی کا مترجم ہوں۔

فکر صاحب: مگر آپ کی تحریروں میں جو بیوی موجود ہے، مجھے تو لگتا ہے۔ وہ آپ کی بیوی نہیں ہے۔

تونسوی صاحب: ہر گھر میں جو بیوی موجود ہے، وہ میرے ہی قلم کی بیوی ہے۔

فکر صاحب: سُنا ہے۔ آپ نے جب سب سے پہلے قلم اُٹھایا۔ تو اُس میں سے شاعری پھوٹی تھی۔ تو پھر آپ نے شاعری کیوں ترک کر دی۔

تونسوی صاحب: شاعری میں نے ترک نہیں کی تھی۔ آپ نے کی تھی۔

فکر صاحب: غلط۔ شاعری آپ کی تھی۔ میرے پاس تو صرف تخلّص ہی تخلّص تھا۔ جو اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ لہٰذا ترک شاعری کا سبب آپ ہی کو معلوم ہو گا۔ شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ کیا وہ عظیم نقاد شرمندہ ہوتے ہیں۔ جو ابتدا میں غزلیں لکھتے تھے۔

تونسوی صاحب: شرمندگی، ارتقائے ناکامی کی معراج ہوتی ہے۔ میری نظمیں انتہائی گہری اور عالمانہ تھیں۔ جو قارئین کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آنا بھی بند ہو گئیں۔

فکر صاحب: تونسوی صاحب! ترک شاعری کا ایک اور سبب بھی تھا۔ کہ جب بیوی آپ کے گھر آئی تو آپ نے شاعری چھوڑ دی۔ یہ سوچ کر کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔

تونسوی صاحب: یہ سبب تو صرف مزاح پیدا کرنے کے لئے آپ نے فضا میں چھوڑ دیا۔ ورنہ اب بھی، آپ کی بیوی بھی ہے اور طنز بھی۔ اور وہ دونوں ایک میان میں سمائی ہوئی ہیں۔ جبکہ بیوی کو آپ اپنے طنز میں نہ لائیں۔ تو طنز لکھ ہی نہیں سکتے۔

فکر صاحب: آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا۔

تونسوی صاحب، کیونکہ میں آپ کا ہمزاد ہوں۔

فکر صاحب: بھائی ہمزاد! آپ کی بیوی والی گفتگو مجھے شائد صحیح تو لگتی ہو۔ مگر اچھی نہیں لگتی۔ لیکن آپ ہر انٹرویو لینے والے کی طرح کسی ادبی مسئلے پر گفتگو کیوں نہیں کرتے۔

تونسوی صاحب: کیوں کروں؟ طنز کو تو بڑے بڑے عالم و فاضل ادب ہی نہیں سمجھتے۔

فکر صاحب: مگر میرا دعویٰ مختلف ہے۔ کہ دُنیا کا اعلیٰ ادب صرف اُسے ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس میں طنز

کی کاٹ ہو۔

تونسوی صاحب: مگر مجھے علما اور فضلہ کے حوالے سے قائل کرائیے۔

فکر صاحب: علمار فضلہ کی پرابلم ہے کہ وہ شعر کی تقطیع تو کر لیتے ہیں مگر ایک بھی اچھا شعر نہیں لکھ سکتے۔

تونسوی صاحب: آپ کا مطلب ہے، گھٹیا شعر لکھ لیتے ہیں۔

فکر صاحب: ہاں، مگر وہ شعر گھٹیا نہیں رہتا جب لتا منگیشکر اُسے سُر تال لگا کر گائے۔

تونسوی صاحب: بجا فرمایا۔ ایک مرتبہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کہ پندرہ بیس آدمیوں کی ایک محفل سجی تھی۔ اور اُس میں ایک صاحب بڑی خوش آہنگی، ترنّم قسم کی آواز کے ساتھ آپ کا ایک طنزیہ کالم سُنا رہے تھے۔ اور لوگ بار بار داد دے رہے تھے۔ کیا آپ کے خیال میں وہ گھٹیا کالم ہوگا؟

فکر صاحب: عین ممکن ہے —— میں نے کئی گھٹیا کالم لکھے ہیں۔ اور عوام داد دے رہے تھے تو میں عوام کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا، کیونکہ عوام کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ موڈ آ جائے تو وہ ایک شام کسی سیاسی لیڈر پر پھولوں کی بارش کرتے ہیں۔ دوسری شام کو اُسے پتھر مارتے ہیں۔

تونسوی صاحب: آپ کا یہ تجزیہ تو عوام کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ سُنا ہے (سُنی سُنائی غلط بھی ہو سکتی ہے) کہ آپ عوام کے ادیب ہیں اور یہ بھی سُنا ہے کہ آپ خدا سے ہمیشہ دُعا کرتے رہتے ہیں۔ کہ غریب عوام ہمیشہ غریب رہیں۔ تا کہ آپ ان پر بہت لکھتے رہا کریں۔

فکر صاحب: میرے متعلق یہ تھیوری میرے ایک موقر دانشور دوست نے ایجاد کی تھی۔ اس ایجاد میں مزاحیہ لہجہ تھا۔ اس لئے میں نے اُس دوست پر تحسین کے ڈونگرے برسائے تھے۔ بعد میں جب اُن تک یہ بات کسی نے پہنچا دی۔ کہ یہ فقرہ ایک انگریز مصنف کی کتاب سے سرقہ کر کے لیا گیا ہے۔ تو نتیجہ دردناک نکلا۔ یعنی اُس دانشور دوست نے میرے ساتھ بول چال بند کر دی — لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ کسی خوبصورت چیز کی تعریف کرنے سے پہلے ایک ہزار بار سوچا جائے۔ اور اتنی بار اگر نہ سوچا جائے تو تعریف ہی نہ کی جائے۔

تونسوی صاحب: لوگ جب آپ کی تحریروں پر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔

فکر صاحب: تعریف انسان کی کمزوری ہے۔ اور میں سوچتا ہوں۔ کہ میں ابھی کافی کمزور انسان ہوں۔ اس لئے بہت کم لوگوں سے ملتا ہوں، محفلوں سے پرہیز کرتا ہوں۔

تونسوی صاحب: مگر کیوں؟ کیا آپ بُزدل ہیں۔

فکر صاحب: بزدل تو ازل سے ہوں۔ مگر مجھے ہمیشہ شبہ رہتا ہے۔ کہ لوگ میری تحریریں پڑھ کر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور ملنے کے بعد میری تحریریں پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔

تونسوی صاحب: گزشتہ دنوں چند دانشور آپ کے قلم کی تعریف کر رہے تھے۔

فکر صاحب: تعریف میں دروغ بیانی کو میں پسند نہیں کرتا۔ لیکن سُنئے، آپ نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ فکر صاحب! وہ کون سے سوشل یا میڈیکل رجحانات تھے جنھوں نے آپ کو طنز نگاری کے لئے متحرک کیا۔

تونسوی صاحب: میں نے اس سوال سے ہمیشہ احتراز کیا۔ کیونکہ مجھے شبہ تھا۔ کہ آپ چند رٹی رٹائی اصطلاحوں میں اس کا جواب دے کر خانہ پُری کر دیں گے۔ مثلاً یہ کہ سماج کی ناہمواری، مضحکہ خیزی، مکاری، ناہنجاری، ہیرا پھیری، بلکہ چک پھیری وغیرہ نے مجھے آگاہی عنایت کی۔ طنز کا تیکھا ہتھیار بھی منفی قدروں کو مثبت میں بدل سکتا ہے۔

فکر صاحب: کچھ اور پوچھئے۔

تونسوی صاحب: تا کہ آپ میری لاعلمی پر کچھ اور قہقہے لگائیں — نہیں، میں آپ سے طنزیہ نہیں، کچھ سنجیدہ باتیں کروں گا۔

فکر صاحب: آپ نے طنز کو سنجیدگی سے علیحدہ کر کے پھر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بہر کیف پوچھئے، میں آپ کی کچھ اور لاعلمیوں کا منتظر رہوں گا۔

تونسوی صاحب: آپ کے خیال میں مزاح کا سماجی مرتبہ کیا ہے۔

فکر صاحب: انشاء اللہ خاں ان کی طرح نواب کے دربار میں جا کر ہر روز ایک لطیفہ سُنانا۔ (ایک لطیفہ بنانا، ایک پکوان کھانا)

تونسوی صاحب: اور طنز کیا چیز ہے۔

فکر صاحب: کڑوی باتوں پر مزاح کا خول کچھ یوں چڑھانا کہ آنسو اور تبسم بیک وقت پیدا ہو جائیں۔

تونسوی صاحب: چارلس ڈکنس مجھے دنیا کا بہترین طنز نگار لگتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فکر صاحب: آہ! مجھے بس یہی خدشہ تھا کہ آپ اسی طرح کے پامال سوال ضرور پوچھیں گے۔ بلکہ یہ بھی پوچھیں گے کہ اردو ادب میں کون سا طنز و مزاح نگار، آپ کو اتنا پسند آیا۔ کہ آپ اس کی نقل کرنے لگے۔

تونسوی صاحب: بطور طنز نگار مجھے تو آپ بھی پسند ہیں۔ اور میں آپ کی نقل بھی کرتا رہا ہوں۔ لیکن اور طنز نگاروں میں ایک نقص ہے کہ وہ اچھے تو ہیں مگر اعلیٰ طنز نگار ہونا پسند نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر آپ ہیں۔ آپ اعلیٰ طنز نگار بننا چاہیں تو قبولیت عامہ کھو بیٹھیں گے۔ اور منفی قدروں کے علم بردار آپ کی اعلیٰ طنز نگاری کو پسند نہیں کریں گے۔ کیونکہ ایک تو یہ اُن کے پاؤں میں ٹیس بن کر چبھے گی۔ اور دوسرے وہ پوری قوم کو مشتعل کر دیں گے کہ فکر صاحب کا طنز ہماری ساماجک، دھارمک اور سانسکرتک پرم پراؤں کی توہین کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے گھر میں ایک کلو گانجا رکھوا کر گرفتار کروا دو۔ اور فکر صاحب اسی لئے آپ اعلیٰ طنز نگار نہیں بنتے۔ صرف دور اندیش بنتے ہیں۔ اور کسی سرمایہ دار کی کوٹھی پر جا کر مئے اور مرغ سے افطاری کھول لیتے ہیں۔

فکر صاحب اور تونسوی صاحب! آپ کا لیکچر لمبا تھا۔ بوریت کا خاص اذیت ناک احساس ہوا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں۔ کہ کیا اب آپ سے کچھ غیر ضروری سوالات پوچھوں۔

تونسوی صاحب: بلکہ صرف وہی پوچھئے۔

فکر صاحب: سوشلزم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

تونسوی صاحب: رشوت کے روپے کو برابر برابر تقسیم کر کے ترنگا لہرانا۔

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

فکر تونسوی کا کچا چٹھا

فکر تونسوی

● اُن کا قول ہے۔ کہ میں پہلی جنگِ عظیم میں پیدا ہوا۔ تیسری جنگِ عظیم میں مر جاؤں گا۔ خود فرماتے ہیں کہ قولِ مرداں جان دارد۔

● اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہزار دعا دیب کی طرح شاعری سے کیا۔ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور ہر سال بہترین نظموں کا انتخاب شائع کیا کرتے تھے ــــ دانشوروں کے اس حلقہ نے ۱۹۴۳ء میں حُسنِ اتفاق سے یا غلطی ہائے مضامین کے باعث اُن کی ایک نظم "تنہائی" اپنے بہترین انتخاب میں شامل کرلی ــ بعد میں وہ حلقہ سالہا سال تک پچھتاتا رہا۔

● اُن کی نظمیں ادق تھیں یا گہری تھیں یا اُن کے شاعرانہ ذہن کی پیچیدگیاں تھیں۔ کہ بظاہر عظیم لگتی تھیں، بہ باطن کچھ پلے نہیں پڑتی تھیں ـ بلکہ احباب نے تو یہ افواہ بھی باقاعدگی سے پھیلا رکھی تھی، کہ یہ نظمیں لکھنے کے بعد خود شاعر کے پلے بھی نہیں پڑتیں۔ چنانچہ شرافتِ نفس کے باعث وہ خود بھی تسلیم کرنے لگے ـ کہ نہ جانے ان نظموں کے ذریعے میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

● مگر شرافتِ نفس کا احساس اُس وقت ہوا۔ جب ۱۹۴۷ء میں اُن کی نظموں کا مجموعہ "ہیولے" مکتبۂ اردو لاہور نے شائع کر دیا۔ خود "ہیولے" کا لفظ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ تو شاعری ترک کردی ـ ترکِ شاعری کی دو تین وجوہ بتلاتے ہیں۔

۱۔ میں نے شادی کرلی تھی اور ایک میان میں دو تلواریں "شادی اور شاعری" نہیں سما سکتی تھیں۔

۲۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں چونکہ ہر انسان دوسرے انسان کا قتل کر رہا تھا۔ چنانچہ آزادی اور غارت گری کے مشترکہ کاز نے میری شاعری کو بھی قتل کر دیا ــ اور فکر تونسوی نے مشترکہ کاز والوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور شاعری کی بجائے طنز نگاری شروع کردی۔ حیرت اور مسرت دونوں ہوئیں۔ کہ طنز نگاری لوگوں کی سمجھ میں آگئی۔

۳۔ اپنے شیریں خواب کی مسماری پر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ہول ٹائم ممبر بن گئے۔ اس لئے شاعری کو مسماری کی وجہ سمجھ کر ترک کر دیا۔

● لاہور میں ترقی پسند ادبی تحریک کے واحد نمائندہ ہوئے "ادبِ لطیف" کی ادارت کے فرائض دیوانگی اور جنون کی حد تک سرانجام دیتے رہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد رفیوجی کیمپ تک پہنچتے پہنچتے چار مہینے لگا دیئے۔ کیونکہ لاہور کو اپنا وطن سمجھتے تھے ـ بارے اُنھیں ایک نوکیلے چھرے نے بے وطن ہونے پر مجبور کر دیا۔

● ادبی رسائل کی تاریخ میں پہلی مرتبہ "سویرا" نام کے ایک ایسے رسالے کو جنم دینے والوں میں تھے۔ جسے دیکھ کر ادبی حلقے پھڑک اُٹھے۔ بعد میں کئی ادبی رسائل نے "سویرا" کی شاہراہ کو اپنا لیا۔ آج تک اپنائے ہوئے ہیں۔ "سویرا" کے نمائندوں میں ممتاز مفتی، فکر تونسوی اور چوہدری نذیر شامل تھے۔

● ۱۹۴۸ء میں جالندھر (پنجاب) میں وارد ہوئے۔ اور ان کی مندرجہ ذیل مجنونانہ سرگرمیوں (جنھیں وہ بزعمِ خود دانشمندانہ سرگرمیاں کہتے تھے) سے دوچار رہے۔

۱۔ "چھٹا دریا" نام کا ایک طویل رپورتاژ قلم بند کیا۔ جس میں برطانوی سامراج کی آزادانہ چال بازیوں اور پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب میں انسانی لہو کے چھٹے دریا کی چشم دید، ہیبت ناک، شرمناک جھلکیاں دکھائیں۔

۲۔ کمیونسٹ پارٹی کے روزنامہ "نیا زمانہ" میں روزانہ ایک طنزیہ کالم "آج کی خبر" کے عنوان سے لکھتے رہے جس سے ڈائرکٹ ان کا رشتہ عوام سے جڑ گیا۔

۳۔ پنجاب کے سینکڑوں گاؤوں میں ایک کندھے پر لاؤڈ سپیکر اور دوسرے کندھے پر "نیا زمانہ" کے بنڈل اٹھائے، پارٹی کا پیغام پہنچاتے رہے۔

۴۔ آل انڈیا ریڈیو پر گاہے گاہے ڈرامے اور خاکے براڈکاسٹ کرتے رہے۔ جس پر ریڈیو کے اعلیٰ حکام بُرا مان گئے، فکر تونسوی نے بُرا نہیں مانا۔ کیونکہ اُن کے براڈکاسٹ کو عوام بُرا نہیں مانتے تھے۔

۵۔ جالندھر سے ہی دو ادبی رسائل شروع کئے گئے، جو مقبول بھی ہوئے اور بند بھی ہوئے۔ اور بند اس لئے ہوئے۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اس میں انقلابی تحریریں شائع کرتے تھے۔

۶۔ اور ۱۹۵۴ء تک ان کی تین مزید نئی کتابیں معرضِ وجود میں آئیں۔

(۱) ساتواں شاستر (۲) تیرِ نیم کش (۳) خدوخال (ادیبوں کے شخصی خاکے)۔ جو بالآخر آؤٹ آف پرنٹ ہوگئے۔ کیوں کہ اُن دنوں اردو زبان کو تقسیمِ ہند کے سبب آؤٹ آف پرنٹ سمجھا جانے لگا تھا۔

● ۱۹۵۵ء میں دہلی تشریف لائے۔ اور دہلی کے مشہور اردو روزنامہ "ملاپ" میں "پیاز کے چھلکے" کے عنوان سے سیاسی اور سماجی مسائل پر روزانہ ایک طنزیہ کالم لکھنے کا تہیہ کرلیا۔ اگر مقبول نہ ہوتا تو شاعری کی طرح جلدی ترک کر دیتے۔ لیکن قبولِ عام و خاص کا حادثہ ہوا۔ اور مسلسل پچیس برس تک لکھتے رہے۔ بمشکل جب آہنی تناؤ پیدا ہوا۔ تو ۱۹۸۰ء میں یہ کالم لکھنے سے باز آئے۔

● ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے سینکڑوں فیچر، خاکے، ڈرامے اور ڈرامچے قلم بند کرتے رہے۔ جنھیں کتابی صورت میں شائع کرنے سے اس لئے گریز کیا۔ کہ بہت سی دوسری طنزیہ کتابیں شائع کروا چکے تھے۔

● دہلی کی اسٹیج پر تین گھنٹے کا ایک میوزیکل ڈرامہ "میری شاعری" پیش کیا۔ دوسرا اسٹیج ڈرامہ اُن کی بے حد شہرت اور قبولیت کا باعث بنا "دربارِ اکبری" تھا۔ مرکزی تھیم، مذہبی تنگ نظری اور تعصب پر بھرپور طنز تھا۔

● آج کل (۱۹۸۲-۱۹۸۳ء) میں تقاضائے فطرت سمجھ کر گوشہ نشینی کی راہِ فرار اختیار کئے ہوئے

(باقی صفحہ ۹ پر)

مجرم

وہ رو رہی ہے ———
کھلی ہوئی چاندنی ہے، ماحول میں نشہ سا گھلا ہوا ہے
نشاط کا دستِ سیمگوں، لہریا دوپٹہ اُڑا رہا ہے
مگر وہ ایسے میں رو رہی ہے
شکستہ اُمید کی بلونی میں آنسوؤں کو بلو رہی ہے

(۲)

وہ رو رہی ہے، وہ مجھ پہ الزام دھر رہی ہے
کہ میں نے کیوں اپنے گیت، جمہور کے بیاباں میں جا کے رو لے
کہ میں نے مظلومیت کی بانبی میں کیوں بغاوت کے ناگ پالے
کہ میں نے کیوں انقلاب کی کھیتیوں میں نغموں کا بیج بویا
کہ میں نے کیوں اس غمِ جہاں کو،
بنا کے سوکن، سجا کے گہنوں سے، اپنے آنگن میں لا بٹھایا
——— وہ رو رہی ہے، وہ کہہ رہی ہے
چلا کے غصے کے تند جیو،
اُبلتی نفرت کی گرم لہروں پہ بہہ رہی ہے
دکھا رہی ہے وہ داغ دل کے،
کہ دیکھ لو، یہ مری تمنا کے پھل نہیں ہیں
یہ میری آنکھیں ہیں، ان میں جھانکو،
یہ ہرنیاں مدتوں سے کاجل کو ڈھونڈتی ہیں
یہ میرے لب ہیں
گلاب ان ٹہنیوں پہ مدت سے سڑ چکے ہیں
یہ میری بندیا ہے، جو ستارے ڈبو چکی ہے
یہ مانگ ہے جس میں آج سیندور کا چراغاں نہیں رہا ہے
یہ میرا ملبوس ہے، کہ میرے سہاگ کی دھجیاں بدن پر لٹک رہی ہیں
یہ میرے بچے ہیں، دھوپ میں کونپلیں سکھائی گئی ہوں جیسے
یہ میرا گھر ہے کہ ذرّے ذرّے میں دردِ کے بھوت خیمہ زن ہیں
یہ میرا جینا ہے ———
——— آتشِ زیست پر کوئی مُشتِ خاک جیسے پڑی ہوئی ہے۔

(۳)

وہ رو رہی ہے ———
وہ میرے شانے پہ اپنا سر رکھ کے کہہ رہی ہے
کہ میں ہی مجرم ہوں اُس کی مرحوم دلبری کا
کہ میں نے ہی اُس کی آرزوؤں کے لاڈلے قتل کر دیئے ہیں
کہ میں ہی کرتا رہا ہوں دُنیا جہاں کی باتیں
مگر نہ اپنی، نہ اپنے گھر کی، نہ اپنے بچوں کی ———
——— زندگی جن کے حق میں دلدل بنی ہوئی ہے

(۴)

وہ رو رہی ہے، وہ چاہتی ہے،
کہ اُس کے اشکوں پہ تڑپ کر تلافیٔ جرم کر سکوں گا
کہ اس کے اُجڑے ہوئے لبوں پر گلاب بن کر میں کھل اُٹھوں گا
کہ جن خیالوں کو میں نے پیہم لہو پلا کر جواں کیا ہے
اُنھیں ندامت کی پھانسیوں پہ چڑھا ہی دوں گا
مگر میں کہتا ہوں میرے یارو ———!
اُسے کہو، میں تمھارا مجرم نہیں ہوں پیاری —!!
اُسے کہو، میں وہ دل نہیں ہوں،
کہ بال آجائے حُسن کے آئینہ میں جس سے
مگر وہ مجرم جو آئینہ کی نظر سے اوجھل رہا ہے صدیوں،
میرے خیالوں نے آخرکار اُس کو شبخون مارتے دیکھ ہی لیا ہے
وہ چاندنی کے کھلے تبسم کو آنسوؤں سے رُلا رہا ہے
جبھی سے دل میں
تمہارا غم بھی جہانِ غم بن گیا ہے پیاری!
کہ دیکھ پایا ہے اُس کو میں نے
تمھارے کاجل کی دھاریوں سے،
وہ اپنی مل کے دھوئیں کو گاڑھا بنا رہا ہے
تمھاری آنکھوں کی ہرنیاں بیچیاہے جا کر ولایتوں میں
تمھارے ہونٹوں کی شہد پر دے کے بولیاں، جیلتا ہے سکے
تمھاری بندیا کو بنک میں رکھ کے سود اپنا نچوڑتا ہے
تمھارے سیندور سے وہ نگیں بنا کے ———
——— لاکھوں سہاگ پل میں اُجاڑتا ہے
تمھارے ملبوس تن کو پیس پیس کے میں نے بارود بنتے دیکھا
تمھارے بچوں کی کونپلوں کو،
مہیب ٹینکوں کے سخت جبڑوں میں پستے دیکھا
تمھارے گھر میں جو درد کے بھوت خیمہ زن ہیں۔
میرے خیالوں کی آنکھ نے اُن کو پنجے گاڑے ہوئے ———
——— ہر اک گھر میں دیکھ پایا ہے جب سے پیاری!
جبھی سے میں بن گیا ہوں مجرم
اُن ہی لٹیروں کا جو مرے سامنے ہی حُسنِ جہاں پہ شبخون مارتے ہیں

فکر تونسوی

چنگاری کی خریداری سے آپ کی زبان اور
کلچر کو فروغ ملے گا

آدمی نامہ

(۱)

دُنیا میں آ رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
دُنیا سے جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کہ آدمی جو آ کے ابھی تک نہیں گیا
مرنے سے ڈر رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اس کو ڈرا رہا ہے۔ سو ہے وہ بھی آدمی

(۲)

ڈاکو، جُواری، چور، سمگلر۔ سو آدمی
اُن کو چھپانے والا بہادر۔ سو آدمی
کچھ ہیں بھگت تو کچھ ہیں مجاور۔ سو آدمی
خنجر بغل میں، مُنہ پہ ہری ہر۔ سو آدمی
اور ان سب کو پوجتا ہے۔ سو ہے وہ بھی آدمی

(۳)

کہنی جو تم کو مار گیا ہے ابھی ابھی
سنیما میں بیچتا ہے یہ ٹکٹیں بلیک کی
جب "ہاؤس فل" کی تختی ہو باہر لگی ہوئی
اللہ بھیج دیتا ہے حاجت روا کوئی
حاجت بڑی بلا ہے۔ سو ہے وہ بھی آدمی

(۴)

ہنس ہنس کے جھوٹ بولے اُسے آدمی کہو
ڈنڈی دبا کے تولے۔ اُسے آدمی کہو
گا کے پرائی چولے۔ اُسے آدمی کہو
مُردے کا خون نکالے۔ اُسے آدمی کہو
پانی سے خوں بہاتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

(۵)

گھر میں جو بھیگی بلی ہے دفتر میں شیر ہے
قسمیں بہت جو کھاتا ہے، کچھ ہیر پھیر ہے
بچہ جو ماں کے ساتھ ہے، سب سے دلیر ہے
اندھے کو ہے اندھیرے سے شکوہ! اندھیر ہے
ہر روپ دوغلہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

(۶)

شاعر غزل چرا کے سُنائے تو داد دو
عینک لگا کے آنکھ دکھائے تو داد دو
گنجا اگر خضاب لگائے تو داد دو
لیڈر اگر ڈنر پہ نہ جائے تو داد دو
ہر راہ دے رہا ہے۔ سو ہے وہ بھی آدمی

(۷)

ننگے بھی آدمی نے بنائے ہیں یاں میاں
اور ننگ تا دکھانے کو ڈالی ہیں جھگیاں
ایک ایک چارپائی پہ سوتے ہیں دس یہاں
انسان سے بھی مہنگی ہوئیں چارپائیاں
اور مہنگی جو بیچتا ہے۔ سو ہے وہ بھی آدمی

(۸)

چلمن کے پیچھے بیٹھا ہوا ہے ہر آدمی
چھوٹا کوئی نہیں ہے بڑا ہے ہر آدمی
اپنی ہی شکل، آپ ہوا ہے، ہر آدمی
ششدر مار رہا ہے ورنہ خدا ہے ہر آدمی
اور یہ جو کہہ رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

فکر تونسوی

آخری غزل

فلک سے اب بھی زمیں پر پیام آتے ہیں
پیمبروں کو نہیں، اب تو عام آتے ہیں
یہی سکھائیں گے آدابِ میکشی تم کو
جو آج بزم سے یوں تشنہ کام آتے ہیں
نصیب اُن کا ہے بس رات کی شہنشاہی
پیامِ صبح ہمارے ہی نام آتے ہیں
یہ بزمِ عشق ہے یاں احتیاط لازم ہے
یہاں فرشتے بصد احترام آتے ہیں
ہمیں ہی فرصتِ نظارگی نہیں ورنہ
سُنا ہے اب بھی وہ بالائے بام آتے ہیں

فکر تونسوی

فکر تونسوی میری نظر میں

کنہیالال کپور

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ وہ جو مرزا سودا کا قلم دان ہوا کرتا تھا اور جو میاں غنچہ کی تحویل میں رہا کرتا تھا، فکر تونسوی کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ چنانچہ جس طرح ہر شخص سودا سے پناہ مانگتا تھا اسی طرح فکر سے خوفزدہ نظر آتا ہے۔ سودا اور فکر میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر ہجو نگار تھے۔ جو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ہجو لکھا کرتے تھے۔ فکر طنز نگار ہیں۔ انھیں اگر کوئی فکر کھائے جاتا ہے وہ قوم یا ملک کا فکر ہے۔ وہ دل کی بھڑاس نہیں نکالتے، دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔

فکر صاحب بڑی مدت سے لکھ رہے ہیں اور اتنا لکھ چکے ہیں کہ اگر وہ اپنا قلم توڑ دیں تو کسی شخص کو افسوس یا گِلا نہیں ہونا چاہئے۔ جہاں دوسرے طنز نگار سال بھر میں بمشکل نصف درجن کے قریب مضامین لکھتے ہیں۔ فکر صاحب اتنے مضامین ایک ہفتے میں لکھ لیتے ہیں۔ تعجب کا مقام یہ نہیں وہ بسیار نویس ہیں بلکہ بسیار نویسی کے باوجود اتنا اچھا لکھتے ہیں۔

انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ پھر خدا جانے انھیں یہ وہم کیسے ہو گیا کہ ان کی شاعری اُن کے علاوہ قارئین کی بھی سمجھ میں نہیں آتی (حالانکہ جہاں تک قارئین کا تعلق ہے۔ وہ اُن کی شاعری کے علاوہ انھیں بھی سمجھنے لگے تھے)۔ اس لئے شاعری ترک کر دی اور طنز نگاری کو پہلے شغل اور بعد میں پیشہ بنا لیا۔ شاید ہی کوئی ایسا خوش قسمت موضوع ہوگا جو اُن کی دسترس سے بچ گیا ہو، ورنہ انھوں نے ہر مضحکہ خیز چیز اور شخص کو ایک "پیاز" تصور کرتے ہوئے اُس کے چھلکے اتارے ہیں۔ اگر اُن کے تمام مضامین کو اکٹھا کیا جائے تو ایک اچھی خاصی انسائیکلوپیڈیا تیار ہو سکتی ہے جس میں آپ کو ڈاکو بننے سے لے کر ڈاکٹر اور تخیل سے لے کر وکیل تک ہر قسم کے طنزیہ مضامین مل جائیں گے۔

فکر صاحب کے پاس کسی یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری نہیں (شیکسپیئر۔ ٹیگور۔ براؤننگ اور غالب کے پاس بھی نہیں تھی) لیکن یونیورسٹی کی اعلیٰ حاصل کرنے کے لئے اب فکر تونسوی پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں اور مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا اگر مستقبل قریب میں کوئی یونیورسٹی انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کر کے اپنی ادب نوازی کا ثبوت دے۔

فکر طنز برائے طنز میں اعتقاد نہیں رکھتے۔ اُن کی طنز ہمیشہ مقصدی رہی ہے۔ لیکن وہ مقصد کو طنز میں اس خوبی اور خوش اسلوبی سے سموتے ہیں کہ وہ طبعِ حزیں پر گراں نہیں گزرتا۔ بقول جگر مرادآبادی:

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

فکر صاحب کے نزدیک طنز وہ حربہ ہے جسے پیغمبروں اور دانشوروں نے بھی استعمال کیا ہے۔ اور اگر اس کے باوجود آدمی کو انسان بننا نصیب نہیں ہوا تو قصور سراسر آدمی کا ہے۔ بہرحال وہ جب کبھی انسان بنے گا اُسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ اِس انقلاب کے لئے اُس سے زیادہ طنز نگار ذمّہ دار ہیں۔ فکر سیاسی طنز لکھنے میں ید طولےٰ رکھتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے ادبی اور معاشرتی طنز پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اُن کا خاص میدان سیاسی طنز ہے۔ طنز کی اس مخصوص صنف میں اُن کا کوئی حریف یا رقیب نہیں معلوم ہوتا ہے۔ سیاستدان یا تو اُن کی طنزیہ تحریریں نہیں پڑھتے یا شرم اُن کو مگر نہیں آتی۔ ورنہ انھوں نے کب سے اپنی مضحکہ خیز حرکتوں سے توبہ کر لی ہوتی۔

ڈاکٹر جانسن نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ اگر کوئی شخص چاہتا ہے وہ پختہ اور خوبصورت نثر لکھ سکے اُسے چاہئے وہ شب و روز اڈیسن کی تحریروں کا مطالعہ کرے۔ میری رائے میں جو شخص طنز نگار بننے کا خواہش مند ہے۔ اُسے چاہئے وہ دن رات فکر تونسوی کے مضامین پڑھا کرے۔

بقیہ فکر تونسوی کا کچّا چٹھا

ہیں۔ اگرچہ اب بھی کبھی کوئی چوٹ انھیں چھو جائے تو بزرگ محترم کا قلم پھر متحرک ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب سانحہ ہے کہ اب کسی کو اپنی پرانی نظلیں سُنا بیٹھیں۔ تو لوگوں کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

● کتابوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔ ۱ بھول چوک کی ذمّے داری گاہک اور دکاندار دونوں پر۔

اُردو ——

۱۔ ہیولے۔ ۲۔ چھٹا دریا۔ ۳۔ ساتواں شاستر۔ ۴۔ خدوخال۔ ۵۔ تیر نیم کش۔ ۶۔ پروفیسر بدھو۔ ۷۔ ماڈرن الہ دین۔ ۸۔ چوپٹ راجہ۔ ۹۔ بدنام کتاب۔ ۱۰۔ فکر نامہ۔ ۱۱۔ فکریات۔ ۱۲۔ وارنٹ گرفتاری۔ ۱۳۔ پیاز کے چھلکے نمبر ایک ۱۴۔ پیاز کے چھلکے نمبر دو۔ ۱۵۔ بارہ ہندوستانی ۱۶۔ آخری کتاب۔ (۱۷۔ گھر میں چور۔ ۱۸۔ بات بیں گھات، زیر طبع)

ہندی ——

۱۔ راجہ راج کرے۔ ۲۔ بارہ ہندوستانی ۳۔ ماڈرن الہ دین۔ ۴۔ وارنٹ گرفتاری۔ ۵۔ کھو کی جانے دو۔ ۶۔ بدنام کتاب۔

● اُن کی تصنیف "فکر نامہ" پر ۱۹۷۸ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کی مختلف کتابوں پر مختلف اُردو اکیڈمیوں نے اعزازی ایوارڈ بھی دیئے۔

● فکر صاحب اکثر حیران ہوتے ہیں کہ جب تک تیسری جنگ عظیم شروع نہیں ہوگی۔ کیا وہ اپنے قلم کو خاموش نہیں کر سکیں گے۔

●●

نریندر لوتھر

سب سے زیادہ لکھنے والا

اردو ادب کی تاریخ میں سب سے زیادہ لکھنے والا، سب سے زیادہ چھپنے والا اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادیب فکر تونسوی ہے۔ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ فکر کا شمار دنیا کی کسی بھی زبان میں سب سے زیادہ چھپنے والے ادیبوں میں ہو گا۔

یہ پڑھ کر آپ شاید مصنفوں کی تصنیفات کی گنتی کرنا شروع کر دیں گے۔ لیکن ذرا ٹھہرئیے۔ یہ محنت بھگو لیجئے کہ نہ جانے کتنے دنوں سے فکر ہر روز تقریباً دو ہزار لفظ لکھتا، چھپواتا اور پڑھواتا ہے۔ اور جس دن وہ الفاظ نہیں چھپتے اس دن ہندوستان کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کی کئی کاپیاں بکنے سے رہ جاتی ہیں۔

یاد رکھئے! فکر ایک روزنامہ کی روزانہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔ کسی اور ملک، اور کسی اور زبان کے کسی ایسے ادیب کی کلیات لائبریری ایڈیشن میں چھپ کر ان پڑھ امیرزادوں کے دیوان خانوں کی زینت بنتیں۔ لیکن فکر کی غلطی بقول خود اس کا پیدا ہونا تھا۔ مجھے اس کے اس فعل (اس کے؟) پر اعتراض نہیں لیکن اگر اس تجربے کے لئے اس نے کوئی اور ملک چنا ہوتا تو اس وقت ہندوستان میں اس کا نام اور روشن دونوں بڑے ہوتے۔ لیکن ایک مدرسہ فکر (تونسوی) کا قول ہے کہ فکر پچھلے جنم میں یورپ میں پیدا ہوا تھا۔ اور اس نے سالہا سال برٹش میوزیم کی لائبریری میں سر کھپائی کر کے ایک بھاری بھرکم کتاب لکھی تھی۔ (کتاب کا نام ڈاس کیپٹل ہے۔ اس کتاب کے نام کے پہلے حصے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب ضرور کسی ہندوستانی نے ہی لکھی ہو گی۔)

کیونکہ اس نے اس جنم میں ریسرچ زیادہ کی تھی اور لکھا کم تھا، اس لئے اسے ایک اور جنم دیا گیا تاکہ وہ پچھلے جنم کی کی ہوئی ریسرچ کی بنا پر دل کھول کر لکھ سکے۔ فکر کے "گرم قلم" کا یہی راز ہے۔

ہندوستان کی معاشی حالت کے پیشِ نظر یہی بہت غنیمت ہے کہ کلیات نہیں تو کم از کم فکر کی تحریروں کا انتخاب ہی اس کی زندگی ہی میں ترتیب دیا گیا اور چھاپا گیا۔ ورنہ لاتعداد مداحوں کے ہوتے ہوئے بھی بعد از مرگ صرف لفاظی پر مشتمل ریزولیوشن، ہی پاس ہوتے ہیں اور ایسی دعا کی جاتی ہے جس کا اثر کم از کم فکر کے کیس میں تو بالکل نہ ہوتا۔

—— بھلا خدا فکر ایسے شخص کو جوارِ رحمت میں جگہ دے کر اپنی عاقبت کیسے بگاڑ سکتا ہے؟

جب سے اردو زبان پیدا ہوئی ہے، ہندوستان کی روایت رہی ہے کہ یہاں کے بادشاہ بھی اپنے مزار اپنی زندگی میں خود ہی بنواتے رہے ہیں۔ لیکن وہ مزار رعایا کے پیسوں سے بنوائے جاتے تھے۔ یہ بدلے ہوئے دور کی علامت ہے کہ آج کی جمہوری حکومت شہنشاہ طنز و مزاح کے لئے ایک کاغذی مزار بھی نہ بنوا سکی۔ بیچارے شہنشاہ کو اس کام کے لئے جمہوریہ کی وزارتِ تعلیم کا "جزوی مالی تعاون" ہی ملا۔ غنیمت —— صد غنیمت!!

میری بیٹی نے جو فکر کے مضامین، سن چکی ہے، لیکن پڑھ نہیں سکتی۔ فکر صاحب کی تصویر دیکھ کر اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا، کتاب بڑی اچھی ہے۔ میں نے پوچھا کیسے؟ تو جواب دیا کہ تصویر بڑی اچھی ہے، لیکن اس میں بھی کچھ

قریب ہے۔ تصویر اگر مزاح کی ہے تو کتاب طنز کی۔ اصل زندگی میں کسی نے بھی فکر کو اتنی خالص اور معصومانہ ہنسی ہنستے نہیں دیکھا۔ تصویر کی یہ ہنسی فکر کی اصلی مسکراہٹ سے تجاوز کر گئی ہے۔ اُمید ہے یہ تصویر فکر کو بے فکری سے مسکرانا اور ہنسانا سکھائے گی۔

فکر تونسوی پوری زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔

ایک زندگی کا نہیں متعدد زندگیوں کا۔ پچھلے جنم سے لے کر اگلے جنم تک اور پھر واپس اس جنم تک شنٹنگ ہوتی رہتی ہے۔ فکر نے ادب اور تاریخ کی کسی بھی روایتی حد کا لحاظ نہیں کیا۔ لکھتے لکھتے وہ زندگی سے موت میں اور موت سے پھر زندگی میں ایسی دیدہ دلیری اور بے فکری سے وارد اور خارج ہوتا رہتا ہے۔ جیسے راج کپور کی فلم میں ہیرو دھند کی تہوں کو چیرتا ہوا ہیروئن سے ملنے جاتا ہے۔ فکر سب دیواروں کو دھند کی دیواریں سمجھتا ہے۔ میری نظر میں فکر کی یہ خاص خوبی ہے۔ اس نے گویا زندگی کو مختلف مدوں کے تحت تقسیم کیا اور پھر ہر مد کے تحت دل کھول کر لکھا۔ فکر تونسوی کتابِ زندگی ہے جس میں ہر مضمون میں دوسروں کی زندگی کا نچوڑ ملتا ہے۔ کئی ادیبوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی تحریروں میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ لیکن بہت کم مصنف ایسے ہیں جن میں "عالمگیری" پائی جاتی ہے۔ طنزیہ ادب میں فکر ہی واحد ایسا ادیب ہے، جس میں "عالمگیری" اورنگ زیبی حد تک موجود ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ نوٹ ہے کیوں کہ فکر، ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے، جن میں اکثر گھسے پٹے موضوعات پر ہی لکھتے رہے ہیں۔ مثلاً مرزا (یہ کیرکٹر، اُردو میں بہت سخت جان واقع ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر طبع آزمائی کیئے بغیر "حُسنِ فروغِ شمعِ سخن" دُور ہی رہتا ہے۔ اس لئے اُردو ادیبوں کی نسل ہا نسل نے اس بے چارے بزرگ کو رُسوا کیا ہے!) "مشاعرہ"۔ "شاعر"۔ "خالہ" یا "چچا جان"۔ (ان کے نام بدلے جاتے ہیں) "شادی"۔ "قرض"۔ "دوست"۔ وغیرہ۔ "بیوی" کو تو ہر ادیب نے پامال کیا ہے (اس پر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بقول فرائیڈ یہ بات بالکل فطری ہے۔ اور ہندی رامائن کے مصنف تلسی داس نے بھی کہا تھا کہ 'ناری' نارن کی ادھیکاری ہے) لیکن ادھر نئی نسلوں کے لکھنے والوں نے کئی نئے اور اچھوتے مضامین کو بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ ان کی تحریروں میں ندرت، تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اِس پہلو سے دیکھا جائے تو فکر اور میری نسل کے ادیبوں میں کوئی "جنریشن گیپ" نہیں ہے۔ فکر کے ہاں اگر موضوعات کی بھرمار ہے تو اسٹائل بھی ہر مضمون کے مطابق کچھ بدلتا رہتا ہے۔ اکثر مضامین، افسانوں کے ڈھانچوں میں ہیں اور انھیں پڑھتے وقت کیفیت وہی ہوتی ہے جو افسانہ پڑھتے وقت ——— لیکن فکر کو پڑھتے وقت آپ کو محتاط رہنا پڑتا ہے، نہ جانے کب نشتر چل جائے مضامین پڑھ کر اکثر "کتھارسس" (CATHARSIS) کا احساس ہوتا ہے۔ آپ "بیویوں کی ٹریڈ یونین" پڑھیے اور بتائیے کہ کیا آخری چند سطروں میں آپ کی آنکھیں پُرنم ہوتی ہیں یا نہیں۔ "فکر تونسوی نے الیکشن لڑا"۔ نہایت ہی پُر اثر مضمون ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد ہمارا وہ خیال اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ الیکشن کی پالیٹکس شریف انسان کے بس کا روگ نہیں۔ "وَر کے لئے کنیا کی ضرورت" یا "چترت رام نے فلم بنائی"۔ میں آپ کو اپنے سماج کے اسٹینڈرڈ کرداروں کے مانوس اور مستند نقوش نظر آئیں گے۔ جن مسئلوں کے بارے میں آپ اکثر شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ سے یا سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے چیدہ چیدہ دوستوں سے پوچھتے آئے ہیں۔ "آخر ایسا کیوں؟" وہ سب آپ کو فکر کی تحریروں میں ملیں گے۔

مجتبیٰ حسین نے فکر کو "بھیڑ کا آدمی" کہا ہے۔ (بھیڑ 'زیر' کے ساتھ بمعنی مجمع کے نہ کہ بکری کے ساتھ ذکر آنے والے جانور کے!) فکر کے مضامین بھی بھیڑ کے مضامین ہیں۔ اُن کے موضوع عوام کے مسائل ہیں۔ وہ مسائل جو ازل

بیدی کی تخلیقات اردو کا سرمایہ افتخار ہیں — اور

عصری آگہی کا راجندر سنگھ بیدی نمبر

تفہیم بیدی کی سب سے کامیاب کوشش ہے۔

بہترین کتابت، سے مزین عمدہ کاغذ پر آفسٹ سے چھپا ہوا۔ آرٹ پیپر پر درجنوں تصاویر کے ساتھ۔

قیمت صرف ۶۵ روپئے

چنگاری کے خریداروں کے لئے خصوصی رعایت

عصری آگہی پبلی کیشن

۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

• پریم چند سے شوکت حیات تک

افسانے کے سفر کی داستان

• افسانے کی پہچان اس کا عمرانی مطالعہ اور افسانے کی تنقیدی کے مسائل ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے والے مضامین اور مستند ترین قلم کاروں کی تخلیقات اور تصاویر کے علاوہ پریم چند سی منار کی تفصیل اور تاریخ ساز روداد سے مزین "افسانہ نمبر" کی کاپیاں اب بھی دستیاب ہیں۔

قیمت صرف چھ روپئے۔

عصری آگہی پبلی کیشن

۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

سعادت حسن منٹو اردو کا سب سے معتوب اور سب سے مقبول افسانہ نگار ہے۔

• اس کی تخلیقات اور اسلوب میں کاٹ اور تیکھا پن کیوں ہے؟
• منٹو کی ذہنی کشمکش اور داخلی انتشار کے اسباب کیا ہیں؟
• منٹو فحش نگاری پر کیوں آمادہ ہوا؟
• منٹو کے کلیدی کردار عورتیں اور مرد کس حد تک منٹو کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ہیں؟
• بدنام کرداروں سے منٹو کو ہمدردی کیوں ہے؟
• منٹو نے اشتعال انگیز تصویر کشی کیوں کی ہے؟
• منٹو اپنے بعض کرداروں کا مماثل کیوں ہے۔؟

یہ اور اس طرح کے بہتیرے دوسرے سوالات کے جواب کے لئے ملاحظہ کیجئے۔

نفسیات کے پروفیسر اور ادیب اور دانشور پروفیسر سید محمد محسن کی کتاب "سعادت حسن منٹو" (اپنی تخلیقات کی روشنی میں)

قیمت مجلد ۳۰ روپئے۔ غیر مجلد ۲۳ روپئے۔

چنگاری کے خریداروں کے لئے خصوصی رعایت۔

دارالاشاعت ترقی

۳/۱۴۱۰ رام نگر۔ شاہدرہ دہلی ۳۲

لوکاچ اور مارکسی تنقید

• مارکسی مفکروں میں لوکاچ کو ممتاز مقام حاصل ہے۔
• لوکاچ ادب، فلسفہ اور سیاست تینوں دنیاؤں کا سیاح تھا۔
• عصری عالمی ادب، فلسفہ اور سیاست کی رفتار سے واقفیت کے لئے لوکاچ کا مطالعہ ضروری ہے۔
• اسی لئے معروف نقاد اصغر علی انجینیر نے اس کتاب میں لوکاچ کی حیات، فن، شخصیت اور تخلیقات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

اگر آپ نے ابھی تک لوکاچ اور مارکسی تنقید کا مطالعہ نہیں کیا تو آج ہی منگوائیے۔

قیمت مجلد ۳۰ روپئے۔ غیر مجلد ۲۳ روپئے۔

چنگاری کے خریداروں کو خصوصی رعایت۔

دارالاشاعت ترقی ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

ملّا دوپیازہ

خواجہ عبدالغفور

بقول خود یہ تونقلی نام ہے اور اصل نام کافی واہیات ہے۔ فکر نے لکھا ہے کہ اگر یہ تونسہ میں نہیں پیدا ہوئے ہوتے تو لاڑکانہ میں ہوتے یا کہیں اور۔ مقام پیدائش سے کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ یہ اپنی جائے پیدائش کو بہت متبرک سمجھتے ہیں کہ وہاں ایک بہت بڑے بزرگ خواجہ نظام الدین رہتے تھے جن کا تعلق خواجہ سلیمان رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کی تقسیم کے وقت خواجہ صاحب نے اعلان کیا کہ اس علاقہ میں کسی ہندو کا قتل وخون ہوا تو مسلمانوں کو میری بددعا لگے گی۔ چنانچہ وہاں پرامن وامان رہا۔

فکر کے ساتھ لاہور میں قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، احمد راہی وغیرہ سب ہی تھے۔ ان میں سے کسی نے اس کی ذمہ داری لی کہ لاہور سے ۳۰۰ میل تونسہ جاکر فکر تونسوی کی بیوی کو لاہور لائیں۔ چنانچہ جب یہ پہنچے خواجہ صاحب کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگ ہندو خاتون کو لینے آئے ہیں تو انھوں نے صریحاً کہہ دیا کہ کوئی ہندو عورت مسلمان مرد کے ساتھ نہیں جائے گی۔ ہم خود ان کو سرحد پر پہنچاکر فکر صاحب کے حوالے کریں گے۔ چنانچہ یہی ہوا اور فکر اگست سے دسمبر تک لاہور میں ڈٹے رہے۔ اس وقت یہ ماہنامہ ادب لطیف کے دفتر میں کام کرتے تھے۔

اس دوران ان کے دفتر میں ایک موٹا تازہ مسلمان غنڈہ گھس آیا اور فکر سے کہنے لگا۔ باہر آؤ آج ہم تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ساحر لدھیانوی اور دیگر احباب نے کہا، یہ ہندو نہیں ہے مسلمان ہے اگر تصدیق چاہئے تو شاہی امام کا وثیقہ لادیں گے۔ اس غنڈہ نے کہا۔ اچھا فی الحال کلمہ تو پڑھو؟ فکر نے بڑی روانی سے کلمہ سنایا اور پھر سب کے سب مصر ہوئے کہ وہ مسلمان غنڈہ بھی کلمہ سنائے۔ وہ ٹھہرا جاہل مطلق "اپنی سلامتی اسی میں سمجھا کہ راہِ فرار اختیار کرے۔"

یہ تعلیم کے لئے تونسہ سے ملتان گئے اور ایف اے کی جماعت میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں قیام و طعام اور تعلیم پر ماہانہ ۲۰/۲۵ روپئے سے زیادہ خرچہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن خاندانی مالی مجبوریوں کے تحت انھیں واپس بلایا گیا اور یہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ گئے لیکن یہ گھر نہیں لوٹے بلکہ ملتان ہی میں ایک پریس میں نوکری کر لی۔ چونکہ پریس کی تنخواہ سے گزر بسر مشکل تھی۔ یہ پریس کے مالک کے گھر کا کام کاج بھی کرتے رہے، اور کچھ ترقی کی سوجھی تو سرمہ نور چشم بنانے والوں کے اشتہار دیواروں پر لکھتے رہے۔ ساتھ ساتھ ریڈیو پر بھی کچھ پروگرام ملتے رہے۔ غرض کہ ان کا حوصلہ ہمیشہ اولوالعزمی کے ساتھ زندگی کی کٹھنائیاں جھیلتے رہے۔

شادی کے وقت یہ بات چھڑی کہ آریہ سماجی طریقے پر ہو کہ سناتن دھرمی۔ لڑکی والوں کے طور طریق پر ہو۔ بحیثیت دُلہا کے ان سے جب دریافت کیا گیا تو بولے مجھے تو دُلہن چاہئے۔ آریہ سماج ہو کہ سناتن دھرم اور لڑکی والوں کی مرضی سے بیاہ رچایا گیا۔

بیوی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔

ان کی قلمی کاوشیں ابتداً شعری تھیں ۱۹۴۲ء میں حلقۂ ارباب ذوق نے ایک شعری مجموعہ شائع کیا اور اس کی نشست میں انھیں بھی مدعو کیا گیا کہ اس مجموعہ میں ان کا کلام بھی شریک تھا۔ یہ لاہور کے دیہاتی انداز میں شلوار قمیص اور کوٹ پہن کر پہنچے کوٹ کی جیب پر ان کی بیوی کے ہاتھوں سے کڑھا ہوا پھول بھی تھا انھوں نے اپنا دعوت نامہ بنایا لیکن ان کی اس حیثیت اور لباس کو دیکھ کر کسی نے بھی یہ نہیں یقین کیا کہ یہی فکر تونسوی ہیں اور اس قدر عمدہ نظم انھیں کی تخلیق ہے، اس واقعہ کے بعد سے انھوں نے انگریزی وضع قطع کا شہری لباس پہننا شروع کیا۔

ایک عرصہ تک یہ شاعری کرتے رہے لیکن ان کا خود کا کہنا ہے کہ وہ کسی کے پلّے نہیں پڑتی تھی اور لوگ انھیں شاعر نہیں مانتے تھے۔

جب یہ ملک کی تقسیم کے بعد دہلی آئے تو انھوں نے جو ذہنی صدمے اٹھائے اور غارتگری دیکھی تو شاعری سے دل بجھ گیا اور یہ طنز و مزاح کے میدان میں اُتر آئے اور غازی بن گئے۔

شاعری بند کرنے کی ایک اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جب ان کی شادی ہوگئی تو انھوں نے سوچا کہ بیوی اور شاعری ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اسی طرح کہ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتی ہیں۔

ان کا پہلا اور آخری مجموعہ کلام 'ہیولے' کے نام سے ۱۹۴۷ء میں لاہور سے شائع ہوا جس کے مقدمہ میں کنھیا لال کپور نے لکھا تھا، فکر دل نہیں دماغ کی شاعری کرتے ہیں۔ سیاسی سماجی مذہبی رومانس شاعری سے ان کا تعلق نہیں ہمیشہ یہ اپنی ذات کے بارے میں لکھتے ہیں چاہے وہ شعری تخلیق ہو کہ نثری۔ جینیس (GENIUS) نام کی نظم میں لکھا ہے۔

میں صدیوں سے تنہا چلا آرہا ہوں۔
میں صدیوں سے غول بیاباں کے زنداں میں گھبرا رہا ہوں۔
میں خاموشیوں جیسے معبد کے گوشہ میں کوئی بت استادہ میرے ذہن پر میری اپنی عظمت کی مہریں لگی ہیں۔

ان کے فکر کی ترجمانی حسب ذیل مقولات کرتے ہیں۔

سچائی اور دوستی میں بڑا فرق ہے۔

چونکہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لئے ہم نے روح ایجاد کر لی ہے اور اس کو لافانی کردیا۔

ماضی کی قبر پر بیٹھ کر مستقبل کی مجاوری کرنا منفعت بخش ہے۔

خدا خود بھی پروپیگنڈے کا سہارا لیتا ہے جب اس نے آفاق کی تخلیق کی تو اس نے اپنے

پبلسٹی ایجنٹوں کی معرفت باقاعدہ اشتہار دیا کہ یہ میری بہترین تخلیق ہے۔

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں۔

جیتے جی میں لوگوں سے تعریف اور گالیاں سُننا چاہتا ہوں۔

فکر تونسوی نے نئے نئے الفاظ تراشے ہیں اور مروجہ الفاظ کو نیا جامہ پہنا کر ان کو دلچسپ معنی دئیے ہیں۔ پیاز کے چھلکے بھی تو ان ہی کی جدت طرازی ہے۔ اگر کچھ سنجیدگی اور دھیان سے یہ لغت ہی تیار کر دیں تو طنز و مزاح کی دُنیا میں ایک زندہ جاوید کارنامہ ہوگا۔

یہ جب ہندستان پہنچے تو دہلی میں ایک پلاٹ گل میر پارک میں الاٹ ہوا انھوں نے جب نقشے وغیرہ منظور کرا لئے تو لوہے کا کوٹہ بھی ملا۔ یہ متعلقہ دفتر پہنچے اور منظوری کا مراسلہ بتا کر لوہے کا پرمٹ مانگا۔ دفتر والوں نے پوچھا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ آپ ہی فکر تونسوی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابیں بتائیں اور بہت سارے حوالے دئیے لیکن کسی نے ان کی بات نہیں مانی۔ یہ مایوس ہو کر اس دفتر سے واپس ہونے لگے تو دفتر کے چپراسی نے ان کو الگ لے جا کر کہا، صاحب مجھے پانچ روپے دیجئے میں تصدیق کئے دیتا ہوں کہ آپ ہی فکر تونسوی ہیں۔

انھوں نے سوچا سرکاری دُنیا میں میری شخصیت صرف پانچ روپے کی حیثیت رکھتی ہے اور مناسب یہی سمجھا کہ مانگی ہوئی رقم دے کر پرمٹ لے لیں۔

دلی ریڈیو سے یہ اپنے مضامین نشر کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے دلی ریڈیو کو ساغر نظامی صاحب کے پاس اسکرپٹ بھیج دیا اور ریکارڈنگ کے وقت پہنچے تو دیکھا کہ ساغر صاحب نے ان کے اسکرپٹ میں کئی جگہ سُرخ روشنائی سے نشان کئے تھے، فکر صاحب کو کچھ اچھا نہ لگا کہ کانٹ چھانٹ کی جائے۔ ساغر صاحب نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا خط کشیدہ حصہ بھی پڑھ لینا ہیں اسکرپٹ پر قلم چلانا پڑتا ہے وہ ہم نے کیا۔ آگے آپ کی مرضی۔

دہلی میں نشہ بندی ہوئی تو مے خانے (بار) بھی بند ہو گئے۔ کچھ احباب ایک دفتر کے بند ہونے کے بعد اس کے احاطے کے اندر برآمدہ میں اکٹھے ہوئے اس میں مخدوم محی الدین، راج کول، مخمور جالندھری وغیرہ بھی تھے۔ پہلا پہلا جام تیار ہوا ہی تھا کہ پولیس کا سپاہی زنداب جاتے ہوئے وارد ہوا اور تحکمانہ انداز میں للکارا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ پہلے تو یہ سب گھبرائے لیکن فوراً ہی ایک پیگ تیار کر کے اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ بھی نہ معلوم کب کا تشنہ تھا رندوں میں شریک ہو گیا۔ نہ جانے یہ نشست کب تک چلتی کہ اس دفتر کے ایک اور افسر جو دیر تک اندر بیٹھے کام کر رہے تھے باہر نکلے اور ان کو بھگا دیا۔ مخدوم نے برف اُٹھایا کسی نے بوتلیں سنبھالیں کوئی کچھ اور۔ غرض کہ رندوں کا مے خانہ جام و سبو اور دیگر لوازمات کے ساتھ برخواست ہو گیا۔

خود کو تعلیم کی دولت نہیں ملی اس لئے انھوں نے اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دی اور وہ سب کے سب علم اور ڈگریوں کی بدولت خوش حال ہیں۔ فکر صاحب نے نام بھی کچھ ایسا رکھا ہے کہ بہت سوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اکثر ہوا ہے کہ کسی محفل میں مسلمان ہوں اور نماز کے وقت جب تیاریاں ہو رہی ہوتی ہیں تو ان سے کہا جاتا ہے "فکر صاحب چلئے نماز کا انتظام برابر کے کمرہ میں ہے۔" ایک بار یہ زندہ دلان حیدر آباد کے اجلاس کے لئے گئے تو انھوں نے نریندر لوتھر کے گھر قیام کیا۔ میزبان کی بیوی نے دیکھا کہ یہ روزانہ پابندی سے صبح غسل کرتے ہیں ان سے رہا نہ گیا انھوں نے پوچھ ہی ڈالا، فکر صاحب آپ مسلمان ہوتے ہوئے بھی روزانہ نہاتے ہیں۔

انھوں نے باقاعدہ نوکری کبھی نہیں کی اور نہ سرکاری نوکری کی پرواہ کی۔ البتہ۔ ملاپ میں کالم نگاری کی حیثیت سے ۲۰ سال تک لکھتے رہے وہ بھی اس طرح کہ روز کا روز اپنا لکھا ہوا کالم بھیج دیا۔ یہی ان کی حاضری رہی ان کی ملازمت رہی۔

انھیں کالم لکھنے میں کبھی کسی قسم کی دشواری نہیں محسوس ہوئی۔ خیالات دماغ میں آتے رہے اور قلم بند ہوتے رہے۔ کہتے ہیں ایک دن انھیں لاکھ سوچنے پر بھی کوئی موضوع نہیں سوجھ رہا تھا یہ اپنے آپ سے بولے دماغ تو صفر ہو گیا ہے اور جیسے ہی صفر کا لفظ زبان پر آیا وہی ایک عنوان بن گیا اور انھوں نے صفر کو آگے پیچھے لگا کر اپنا کالم تیار کر لیا۔

ابتداً انھیں اس کا بالکل احساس نہ تھا کہ ان کے کالم اتنے مقبول اور ہر دل عزیز ہیں کہ جس محلہ میں اخبار کی ایک کاپی پہنچ جاتی ہے وہاں آٹھ دس آدمی اکٹھے ہو کر کسی پڑھے لکھے آدمی سے اس کالم کو پڑھوا کر بڑی دلچسپی اور پابندی سے سنتے۔ جیسے کہ پُرانے زمانے میں کتھا واچک ہوا کرتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی کچھ لوگوں نے ان کو تلاش کر کے درخواست کی کہ کسی دن وہ خود ان کے محلے میں جا کر اپنا کالم سُنائیں۔ چنانچہ یہ ایک حلقہ ذوق میں گئے تو کئی محلوں میں سے فرمائشیں اور درخواستیں آتی رہیں اور یہ اپنی سہولت سے ان کی تعمیل کرتے رہے۔

ایک دن ان کے اخبار میں ایک اشتہار شائع ہوا۔ گم شدہ بھینس کی تلاش، اس میں بھینس کی خصوصیات وغیرہ کی طرف اشارے تھے۔ انھوں نے اس کو موضوع بنا کر اپنا کالم لکھ ڈالا۔ جس دن یہ شائع ہوا اس دن اخبار کے منیجر نے ان کو بُلا بھیجا، جہاں پر اس گم شدہ بھینس کے مالک تشریف فرما تھے، جو بہت ہی ناراض تھے اور غصہ کر رہے تھے کہ ان کی بھینس کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی توہین کی گئی اس وقت تو کسی نہ کسی طرح بات وقت گزشت ہو گئی لیکن دو دن بعد اس بھینس کے مالک نے دفتر آکر ان کا شکریہ ادا کیا کہ اشتہار کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے کالم کی مقبولیت کی وجہ سے ان کی بھینس مل گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ گھٹیا شاعر بہ آسانی بڑھیا نثر نگار بن سکتا ہے۔ چنانچہ طنز و مزاح کو اپنا کر انھوں نے ہزاروں صفحے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

میرے انتقال کے بعد

فکر تونسوی

اور انتقال کے پورے تیرہ دن بعد میں قبر میں زندہ ہوگیا۔

قبر سے باہر نکلتے ہی میں نے دیکھا۔ کہ میرا کوئی کتبہ موجود نہیں تھا۔ ممکن ہے، لواحقین کو کتبے پر تحریر کرنے کے لئے کوئی خوبصورت فقرہ نہ سُوجھا ہو۔ یوں لگا، میرے ساتھ خوبصورتی کی سُوجھ بوجھ بھی مرگئی تھی۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا۔ میں نے اپنی ایک کتاب میں اپنا کتبہ لکھ دیا تھا۔ نہ جانے وہ کون سی کتاب تھی اور نہ جانے کون سا دوست مجھ سے وہ کتاب مانگ کر لے گیا تھا اور نہ جانے کیوں اُس نے واپس نہیں کی تھی۔ بہر کیف کتبے کے بغیر قبر مجھے یوں لگی جیسے والدین کے ہوتے ہوئے کوئی بچہ یتیم خانے میں داخل ہوگیا ہو۔

قبر سے نکلنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا۔ کہ میری جسمانی اور ذہنی ہیئت کذائی میں سوائے اس کے اور کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کہ میں تیرہ دن تک شیو نہیں کرسکا تھا۔ اگر پسماندگان میں دُور اندیشی ہوتی۔ تو شیو کا سامان بھی قبر میں دفن کر کے رکھ جاتے۔ مگر آہ! زندہ آدمیوں کی دُور اندیشی اس سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ کہ انتقال کے بعد شیو کی ضرورت نہیں رہتی۔

میرے انتقال کی تصدیق ڈاکٹر صوفی صاحب (ولایت ریٹرن) نے بھی کردی تھی۔ مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ اس نے اپنی تشخیص کی فیس پچاس روپے اُس وقت وصول کرلی تھی۔ جب کہ ایک منٹ بعد میں انتقال کرنے والا تھا۔ ہاں، وصولیٔ فیس کے بعد گھڑی دیکھ کر انھوں نے اعلان کیا۔ کہ مریض، دارِ فانی سے کوچ کرچکا ہے۔

جو حضرات میرے جنازے کے ہمراہ چلے میرے خیال میں اُن کی تعداد معقول نہیں ہوگی۔ کیونکہ اُسی صبح ملک کے ایک بہت بڑے لیڈر کا جنازہ بھی نکلنے والا تھا۔ اس لئے ہزاروں افراد نے صرف محترم لیڈر کے جنازے میں شرکت کرنے کو ترجیح دی ہوگی۔ اگرچہ مجھے یقین تھا۔ کہ وہ ہزاروں افراد میری تحریروں کے بھی مدّاح تھے میں نہیں جانتا۔ ادیبوں کو مرنے کے بعد احساس ہوتا ہے یا نہیں۔ کہ مدّاحوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ جو لیڈر حضرات قوم کی تقدیر بدلنے کے مسلسل وعدے کرتے ہیں۔ احترام کے اہل وہی ہوتے ہیں۔ اور رواج یہی تھا کہ برسراقتدار حکومت بھی اپنی لیڈروں کے لئے ایک دن جھنڈا سرنگوں کرتی ہے۔ کسی اہل قلم کے لئے نہیں۔ قوم رواج کی اسیر ہوتی ہے۔ اور رواج سے ہی جنازے کی رونق بڑھتی ہے۔

میں اس رواج کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اگر دیتا۔ تو لیڈر کے مرنے کے ایک دن بعد مرسکتا تھا۔ خوددار آدمی اگر انتقال کرنا چاہے۔ تو پہلے یہ ضرور معلوم کرلے کہ کوئی لیڈر تو اپنا جنازہ نکالنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

اور میں نے سوچا۔ کہ میرے انتقال پر سب سے زیادہ مسرت صرف دو اشخاص کو ہوئی ہوگی۔ ایک وہ آدمی جس نے ڈیڑھ سال پہلے مجھ سے پانچ سو روپے قرض لیا تھا۔ اور دوسرا وہ جو مجھ سے دوسرے درجے کا طنز نگار تھا میرے بعد وہ اوّلین پوزیشن کا مستحق ہوگیا ہوگا۔

زندگی میں وہ دونوں مجھ سے کشیدہ خاطر ہوگئے تھے، ملاقات اور بول چال بند۔ مگر اُن کی یہ کشیدہ خاطری یک طرفہ تھی۔ میرا اصول ذرا یوں مختلف تھا۔ کہ میں قرض کو قرض نہیں سمجھتا تھا، دان سمجھتا تھا اور دوسرے یہ کہ میں طنز کو ادب ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اوّلین اور دوسری پوزیشن کا سوال غیرضروری تھا۔ مگر آہ! کہ یہ دونوں اشخاص عمر بھر میرے ان اُصولوں سے آگاہ نہیں ہوسکے۔

میرے انتقال کے بعد وہ عالمِ طرب میں میری ماتم پرسی کے لئے ضرور تشریف لائے ہوں گے۔ ممکن ہے۔ ان کے آنسوؤں کی تعداد نسبتاً سب ماتم گساروں سے زیادہ ہو۔ یہ تعداد اُن کی خوشی کا مظہر ہوگی۔ آنسو اور تبسم کس طرح ایک دوسرے کا ترجمہ بن جاتے ہیں۔ انسانوں کو اس کا بھی علم نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُنھوں نے میرے جنازے پر پھولوں کے جو ہار نذر کئے ہوں۔ اُن کی کوالٹی بھی بہتر ہو۔ ہاروں کا یہ صدقہ، صدقہ نہیں، بطور دان پیش کیا ہوگا۔ قرضے ڈوب جاتے ہیں، لیکن دان زندہ رہتے ہیں۔ قبر کے سرہانے کھڑے کھڑے میرے ذہن میں قرضے اور دان کی بات طویل ہوتی گئی۔ اور طوالت یوں بھی میری خصلت بن چکی تھی۔ مثلاً مجھے یاد آیا۔ کہ انسانیت کے مارے ہوئے ایک بہت بڑے تاجر نے ایک عظیم الشان عبادت خانے کی تعمیر کے لئے دس لاکھ روپیہ دان کیا تھا۔ چنانچہ عبادت خانہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ برسوں زندہ رہا۔ وہ تادیر بھی زندہ رہ سکتا تھا۔ لیکن اللہ کو جس کے لئے یہ عبادت خانہ تھا، یہ منظور نہیں ہوا۔ ایک سو پانچ برس بعد اسی عبادت خانے کے مسئلے پر فرقہ وارانہ فساد شروع ہوگئے۔ کیونکہ ایک فرقے کے پاس تواریخی شواہد موجود تھے کہ یہ ہمارے خدا کا عبادت خانہ تھا۔ تواریخی شواہد دوسرے فرقے کے پاس بھی موجود تھے کہ دو ہزار برس پہلے اسی جگہ پر ہمارے خدا کا عبادت خانہ تھا۔

اور تواریخ نے ہمیشہ نئی تواریخ پیدا کرنے کے امکانات پیدا کئے ہیں۔ ایک تواریخ ہوتی ہے تو اُس کی قبر پر دوسری تواریخ کی تعمیر کی جاتی ہے۔ عبادت خانہ جھوٹا یا سچا ہوسکتا ہے مگر تاریخی شواہد کبھی جھوٹے نہیں ہوتے۔

چنانچہ جھوٹ اور سچ کو ثابت کرنے کے لئے اس عبادت خانے کو آگ لگادی گئی۔ بلکہ آگ کے ان شعلوں میں ایک ہزار انسان بھی پھونک دیئے گئے۔ جلنے والوں میں دونوں فرقوں کے انسان شامل تھے۔

میرا انتقال پینسٹھ برس کی عمر میں ہوا۔ مرنے کے لئے یہ موزوں عمر تھی۔ کسی کو کچھ زیادہ بُری نہیں لگی ہوگی۔ لیکن میری ماتم گساری کے

لیے وہ جوتشی صاحب تشریف نہیں لائے ہوں گے۔ جس نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر بڑے ستارہ شناسانہ انداز میں کہا تھا۔ کہ تمہاری وفات بچھتر برس سے پہلے ہو ہی نہیں سکتی۔ میری ماتم گساری کے لیے وہ اس لیے تشریف نہیں لا سکا۔ کیونکہ اُس کی بھی ایک خاص مجبوری تھی یعنی وہ مجھ سے پانچ سال ہی پہلے انا للہ و انا الیہ راجعون ہو چکے تھے۔ اور ایسی ہی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں جو انسانوں کے سوشل تعلقات میں خلل ڈالتی ہیں۔

میرا انتقال ہارٹ اٹیک سے ہوا تھا۔ ان دنوں اس آدمی کو خوش قسمت سمجھا جاتا تھا جو کُڑھ کُڑھ کر نہیں مرتا تھا۔ چنانچہ میری موت سے ایک ہفتہ پہلے میرا ایک پڑوسی صبح کی چائے پینے لگا۔ تو پہلے گھونٹ کے بعد ابھی دوسرا گھونٹ بھرنے ہی والا تھا۔ کہ اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے جیسے کہنے لگا خ

اس کپ کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں اور کرسی پر لڑھک گیا۔ یہ لڑھک جانا فقط ہارٹ اٹیک کی برکت تھی۔ چنانچہ ہارٹ اٹیک کے بعد چاروں طرف سے اُس کی بے حد ستائش کی گئی۔ اسے انتہائی نیک خصلت ڈکلیر کر دیا گیا بلکہ نیک خصلتی کے اعزاز میں اس کی ایک فوٹو بھی کرسی سمیت اخبار میں شائع کی گئی۔ یہاں تک لکھ دیا گیا کہ مرحوم کی سیرت میں اتنا خلوص نیت تھا کہ چائے کا کپ بھی گرا نہیں، ٹوٹا نہیں، بچ گیا بلکہ محکمہ آثار قدیمہ کے ایک افسر سے یہ بیان دلوایا گیا کہ آئندہ ہماری کھدائیوں کی تاریخ میں ایسا کپ شاید ہی کہیں ملے۔

قبر میں جب میرے دل کی دھڑکن پھر شروع ہو گئی۔ تو میں نے سوچا، اب یوں قبر میں ہی پڑے رہنا انتہائی جاہلانہ فعل ہے۔ لہٰذا میں ... ارد گرد کی مٹی کو دھکے دے دے کر باہر نکل آیا۔ تو باہر نکلتے ہی مجھے دو شدید افسوس ہوئے۔ کہ آہ! میرا یہ ہارٹ اٹیک بھی چاندنی چوک میں خریدے ہوئے ٹیبل فین کی طرح ڈپلی کیٹ تھا۔ اور دوسرے یہ کہ کہیں میری نیک خصلتی بھی مشتبہ تو نہیں تھی۔

کفن سے کُرتے تک

بہر کیف قبر سے نکلا۔ تو سہ پہر کی سردی نے میرے عضو عضو کو تابندہ کر دیا۔ ہوا کی لہریں اگرچہ وہ لُو کی تند لہریں تھیں) میرے سانسوں سے ٹکرائیں۔ تو کرنوں اور گھر کے لمس سے مجھے یوں لگا جیسے میں ایک نیچرل انسان ہوں۔ قبر میں تو صرف ایسی تاریکی تھی جو کبھی نہ ختم ہونے والا خوف دلاتی تھی۔ اور پھر وہاں نہ سورج تھا نہ ہوا تھی۔ تعجب ہوا کہ جب قبر اتنی خلاف نیچر کی چیز تھی تو لوگ اس میں اپنے احباب اور رشتے داروں کو دبا کیوں دیتے ہیں۔ کیا مرحوم کا خلاف فطری ہو جانا انھیں سکون قلب عطا کرتا ہے۔؟

سورج کی کرنوں نے مجھے چمکا تو دیا لیکن اُس کے ساتھ ایک دردناک خیال بھی چمک اُٹھا۔ کہ میرے بدن پر جو لباس ہے اس کا نام کفن ہے۔ صدیوں کی تہذیب بھی اس لباس کو ابھی شائستگی عطا نہیں کر سکی۔ اس لیے شرفا کفن پہن کر بازاروں اور سڑکوں پر نہیں نکل سکتے۔

بڑا ملال ہوا کہ جب کفن شرفا کا لباس نہیں ہے تو شرفا کو کفن کا اعزاز کیوں سمجھا جاتا ہے۔ یہ کیسی تہذیب ہے اس تہذیب میں کیسا تضاد کہ سڑکوں پہ کچھ اور قبروں پر کچھ اور۔ میں عمر بھر تہذیب کے عروج کی پبلسٹی کرتا رہا گویا کافی حماقت سے کام لیتا رہا۔ یہ علم تو قبر میں جا کر ہی ہوا۔ کہ کفن ہی دنیا کی تہذیب، کفن ہی اس کا عروج۔

"لیکن فکر تونسوی پیارے" میں اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔ اگر اس کفن کی ہیئت کذائی میں باہر دنیا میں نکلو گے تو لوگ تمھیں انسان تھوڑے کہیں گے، بھوت کہیں گے۔ ممکن ہے بھوت سمجھ کر چیخ ماریں اور بھاگ جائیں۔ اور جو لوگ چیختے ہیں، بھاگتے ہیں، ہراساں ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ تم نشاط کے روابط کیسے رکھ سکتے ہو۔ یہ روابط تو انھیں زیب دیتے ہیں۔ جو حکمرانوں کے جنگ بازانہ آتشیں اسلحہ سے ڈر کر بھاگتے چیختے اور جائے پناہ تلاش کرتے ہیں۔ اس چیخ دہاڑ پر ہی حکمران قہقہے لگاتے ہیں۔ اور پھر نعرہ "زندہ باد، زندہ باد۔ ..."

تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ میں سوچنے لگا۔ اگرچہ میرا کفن بے حد بیش قیمت ہے۔ اقربا نے میرے پورے بینک بیلنس کو جیسے کفن میں بدل دیا تھا۔ لیکن اس وقت میری پرابلم بیش قیمت نہیں تھی۔ بلکہ کوئی سیدھا سادہ لباس تھا۔ چاہے وہ فیئر پرائس شاپ کی گھٹیا ترین کوالٹی کا کیوں نہ ہو۔ اُس گھٹیا لباس کو پہن کر اگرچہ گھٹیا غریب ہی لگوں گا۔ لیکن اسے پہن کر بازار میں نکلوں گا۔ تو لوگ چاہے مجھے غریب سمجھیں۔ مگر انسان تو سمجھیں گے۔ یہ ہمارے ملک کی خوش نصیبی ہے کہ اس کے غریب کو بھی انسان سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ غریبی تو اب ایک کوالٹی بن گئی ہے کہ غریبوں کے مفاد پر تقریریں کرتے کرتے کئی سیاسی لیڈر کوٹھیوں اور کاروں کے مالک بن جاتے ہیں۔

مگر وہ سادہ اور غریبانہ لباس کہاں سے ملے گا؟

اچانک مجھے خیال آیا۔ کہ گلی تاشیان والی میں ایک صاحب بنسی لال نامی رہتے ہیں۔ جو مُردوں کے کفن خریدنے اور بیچنے کا دھندا کرتے ہیں۔ پیشہ ور کفن چوری سے سستے داموں کفن خرید لیتے ہیں۔ اور پھر شہر کا پسماندہ طبقہ جو نیا کفن خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ انھیں وہ کفن مہیا کر دیتے ہیں۔ قبر سے کفن اگر تین روپے میں آتا۔ تو اسے پریس وغیرہ کروا کر تین چار گنا دام پر فروخت کر دیتے۔ اور اسے مجبوری آدم کہا کرتے۔ فرض کیجیے، کسی رئیس کا کفن اُن کے ہاتھ لگ جاتا۔ تو وہ مجبوری آدم کی خاطر کسی مردہ رکشا پلر کو پہنانے کے لیے عنایت کر دیتے۔ دو سو روپے کا کفن بیس پچیس روپے میں۔ جسے پہن کر وہ رکشا پلر تو لگتا ہی نہیں تھا، رئیس لگتا تھا۔ مجبوری آدم کا یہ کمال تو کارل مارکس کے علم برداروں میں بھی نہیں تھا۔ ایسا کوئی علم بردار ایک بھی رکشا پلر

کو رئیس نہیں بنا سکا۔

بنسی لال اگرچہ ایک بدسرشت انسان تھا۔ ایسے بدسرشتے کا احسان اُٹھانا میرے لئے ذہنی کوفت تھی۔ مگر اس وقت سوال یہ کوفتی کا نہیں تھا۔ انسان بن کر دکھانے کا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا۔ کہ میرا یہ بیش قیمت کفن کم از کم تین سو روپے کا ضرور ہوگا۔ موت سے ایک دن پہلے میرا بینک بیلنس تین سو روپے تھا۔ لیکن اگر بنسی لال اس کے بدلے میں مجھے بتیس۳۲ پچیس۲۵ روپے کا کرتا یا پجامہ دے دے تو بنسی لال کی سرشت کو وہ انسان بھی قدر اعلیٰ کہے گا جو اُس کی بدسرشتی پر عمر بھر تھوکتا رہا ہے۔

ہائے، کاش! اگر معاشرہ ذرا دانشور ہو جائے، تو مُردے کو کفن پہنانے کے بجائے ایک کُرتا پاجامہ ہی پہنا کر دفنا دیا کرے۔ تو موت کتنی آسان لگے۔ اور مکرر آئے اکہ مُردے کے پاؤں میں جوتا بھی نہیں پہناتے۔ ممکن ہے اس لئے نہ پہناتے ہوں۔ کہ مرحوم اب چل پھر تو سکے گا نہیں۔ اس لئے ایک جوتا خواہ مخواہ کیوں ضائع کیا جائے۔ کم از کم زندہ لوگوں کے لئے کسی کے سر پہ مارنے کے کام ہی آجائے گا۔ بلکہ کیوں نہ کسی غریب کو خیرات میں دے دیا جائے۔ جو اپنے سر پہ آپ ہی جوتا مارنے میں کوئی عیب نہیں سمجھتا۔ مرنے والے کے لئے تو جوتے کا کوئی مصرف ہی نہیں۔

لیکن معاشرے کو معلوم نہیں کہ کئی مُردے مستثنیات میں بھی ہوتے ہیں۔

بہر کیف میں شام کے سائے ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ آہ! یہ شام کے سائے کتنے آہستہ آہستہ چلتے ہیں—بڑی دیر کے بعد جب اندھیرا ہوتا۔ تو میں چوری چُھپے گلیوں گلیوں بنسی لال کفن فروش کے دروازے پر جا پہنچا۔ اور دروازہ کھٹ کھٹایا۔

اندر سے آواز آئی کون ہے؟...

"ایک بھکاری!"

"بغل کے مکان میں جاؤ، وہ سمگلر ہے۔ خُدا سے ڈرتا ہے، خیرات میں یقین رکھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا وہ کفن فروش ہے؟ کیونکہ میرے پاس ایک کفن ہے۔" کفن کے لفظ پر اُس نے دروازہ کھول دیا۔ مگر میری ہیئت کذائی دیکھ کر چیخا۔

"بھُوت! بھوت!"

"بھوت نہیں، فکر تونسوی۔ مُردہ بذاتِ خود کفن بیچنے آیا ہے۔ خریدو گے۔ مال سستا، "کوالٹی اعلیٰ" کفن دیکھ کر اُس کے حواس بجا ہوئے۔ خالص تاجرانہ نگاہ کفن پر ڈالی۔ اور بولا "معاف کیجیے" کیا نام بتایا تھا تم نے؟

"فکر تونسوی"

"خیر" کوئی بھی تونسوی تونسوی ہو۔ لیکن کفن تھرڈ کلاس ہے۔ اسے خرید کر میں اپنے دھندے کا معیار نہیں گرانا چاہتا۔ زندگی میں کون سا کام کرتے تھے۔"

"غریبوں سے ہمدردی کرتا تھا۔"

"جبھی چوٹ کے غریب لگتے ہو۔ میں بھی غریبوں سے ہمدردی کرتا ہوں، اس لئے کفن کے گھٹیاپن کو نظر انداز کر دوں گا۔ بولو، کیا چاہو گے اس کا؟"

اور دوسرے ہی لمحے اُس نے میرے کفن کو انسانیت عطا کر دی۔ اپنا ہی ایک بَتلا کرتا، پھٹا ہوا پاجامہ اور اُس سے بھی پھٹی ہوئی باٹا کی چپل (یہ باٹا کمپنی غریبوں کے لئے چپل اور بوٹ بنا بنا کر ارب پتی ہوئی تھی)

اور وہ لباس پہن کر مجھے ایسا لگا۔ جیسے اس کی کوالٹی میرے ادب سے بہتر ہے۔

بقیہ ملا دو پیازہ

لکھ ڈالے اور کروڑوں مدّاح پیدا کئے۔ خود رو رو کر اوروں کو ہنساتے ہیں اور ہنسی ہنسی میں رُلانے کا فن اپنایا ہے۔

جدّت اور تازگی کی تلاش نے انھیں ادبی موت کا شکار نہیں ہوتے دیا نہ ہی جمود طاری ہوا ہے اور نہ اس کا امکان ہے۔ پیاز کے چھلکے چھیلتے ہیں اور تہ بہ تہ نچلی پرت سے تازگی اُبھرتی ہے اس لئے اپنے فکاہی کالم کو پیاز کے چھلکے کا مستقل عنوان دے رکھا ہے اور اس حساب سے پرت در پرت فکاہات مطائبات مضحکات طنزیات ادھیڑتے ہیں؛ جن کو پڑھ کر لوگ کہتے ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

انھوں نے کبھی روپیہ پیسہ کی پرواہ کی نہ اس کی لالچ رہی لیکن اپنی قلمی صلاحیت کو انھوں نے مفت نہیں بانٹا اور نہ کبھی ماڈوانس روپیہ مانگا۔ ان کی زندگی میں ایک دن ایسا بھی آیا تھا کہ بیوی نے کہا چولہا جلانے کے لئے لکڑیاں نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی جیب میں کچھ تھا کہ جس سے لکڑیاں خرید کر لائیں۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ دن ان کی زندگی کا بڑا اداس تھا کہ انھیں کچھ کتابیں کباڑی کے ہاتھ بیچنا پڑیں۔ کچھ عرصہ قبل تجویز ہوئی کہ ایک فنکشن کیا جائے اور روپیہ جمع کر کے ان کو موٹر دلائی جائے کسی نے یوں ہی پوچھا موٹر آجائے گی تو فکر صاحب کیا کریں گے۔ یہ بولے۔ سبزی ترکاری اس میں رکھ کر محلّہ محلّہ بیچتا پھروں گا۔

فکر تونسوی اپنی دُنیا میں مگن رہتے ہیں انھیں کسی سے شکوہ ہے نہ شکایت۔ حالانکہ گیان پیٹھ۔ ساہتیہ اکادمی۔ اردو ترقی بورڈ یا کسی اور اکادمی نے ان کی صلاحیتوں علمی ادبی کاوشوں کو کسی طرح بھی مستحق قرار نہیں دیا۔ ان کے کروڑ ہا مدّاح ہیں اور انھوں نے ہزار ہا صفحے اپنے اسی قلم سے رنگین کئے ہیں۔

فکر کی تخلیقات میں قابلِ ذکر ہیں۔—

زور خطابت: کچھ اپنی کچھ پرائی، شوخی گفتار، عرق اشکال، پیاز کے چھلکے (آٹھ اخباری کالم)، ماڈرن الہ دین، وارنٹ گرفتاری، عالم بالا ایک ماتم، فکر نامہ۔

یہ فکر نہیں در اصل مفکر ہیں اس لئے انھوں نے فکر نامہ تصنیف کر ڈالا۔ ان کے مزاج کی خوبی یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہدف ملامت بناتے ہیں — لوگوں کو چڑاتے نہیں، یہ بسیار نویس اور زود نویس ہیں اس کے باوجود مزاح کا اعلیٰ ترین معیار برقرار رکھا ہوا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو طنز نگاری آج آخری لمحوں میں ہے اور فکر تونسوی کو آخری طنز نگار کہا جا رہا ہے جو خود ہی نہایت گہرے طنزیہ انداز میں پوچھ رہا ہے۔

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد؟

سقراط بڑا خوش قسمت تھا

سقراط بڑا خوش قسمت تھا
اک جامِ زہر پیا اُس نے
اور ملکِ عدم کو جا پہنچا
ورنہ اِس ظالم دُنیا میں
تھیں وہ وحشی تعزیریں بھی
تھا جن کا عذاب اتنا سنگیں
خود موت بھی شرما جاتی تھی
ہاتھی کے پاؤں کے نیچے
مجرم کو کچلا جاتا تھا
زندہ تابندہ جسموں میں
کیلیں بھی ٹھونکی جاتی تھیں
خود عیسیٰ کا یہ حال ہوا
دیتے تھے سزائے موت جنھیں
اُن کے ٹکڑے کر دیتے تھے
یا اُن کی روشن آنکھوں میں
پگھلا سیسہ بھر دیتے تھے
اور شیروں سے نچواتے تھے
دُنیا میں ہوئے ایسے بھی ستم
بے رحم حکومت باغی کے
معصوم، جیالے بچوں کو
دیوار میں چنوا دیتی تھی

انسان درندہ وحشی ہے
جب بھی وہ بالادست ہوا
اُس نے کمزور انسانوں کو
بارہا اذیت دے دے کر
انسانوں نے انسانوں کو
جو موت بھی دی تو عذاب آگیں
سقراط بڑا خوش قسمت تھا
جو اپنے خیالوں کی خاطر
آرام کی موت مرا، مر کر
خوش نام ہوا، جاوید ہوا
سقراط بڑا خوش قسمت تھا

کرشن موہن

نام دیو دھاسل
ترجمہ: عارج میر

اب

پیٹھ کیے سورج کی اُور
سفر کیا صدیوں اس نے
منکر ہو جانا چاہیے اندھیری مسافرت سے، اب
یہ ہمارا باپ اندھیرا
ڈھوتے ڈھوتے آخر بوڑھا ہو گیا
اب نیچے رکھنا ہی چاہیے اُس کی پیٹھ کا بوجھ
اس شہر ارم کے لیے آخر اپنا خون بہا
اور یادداشت میں پتھر کھائے
فلک کا بوسہ لیتی بلڈنگوں کو،
اب سُرنگ لگانا ہی چاہیے
ہاتھوں میں سورج مکھی پھول رکھنے والا فقیر
ہوا پار آور ہزار سالوں میں
اب سورج مکھی پھول کی صورت
ہمیں سورج مکھی ہو جانا چاہیے

مرہٹی نظم

مجھے اندر ہی اندر چاٹتا ہے
یہ کیسا خوف مجھ میں پل رہا ہے
درختوں کی گھنی لذت نہ ڈھونڈو
ابھی میلوں برہنہ راستہ ہے
یہی صدیوں سے سنتے آرہے ہیں
سوا نیزے پہ سورج آچکا ہے
جسے میں ٹکڑے ٹکڑے کر چکا تھا
وہی پھر سامنے سالم کھڑا ہے
میں اپنے آپ میں محفوظ لیکن
مرے اندر کوئی پر تولتا ہے
درختوں کا لہو شامل ہے شاید
ہوا کا ذائقہ بدلا ہوا ہے
یہ کس منظر میں نظریں ڈوبتی ہیں
یہ کیسا بوجھ آنکھوں پر لدا ہے

بیگانۂ طلسم تماشا نہ تھا بہت
ہاں میں نے اُس کو غور سے دیکھا نہ تھا بہت
کوئی نگاہ سطح سکوں تک نہ جا سکی
ملبوسِ اضطراب شکستہ نہ تھا بہت
جو رنگ ہے اُسی کی عقیدت کا رنگ ہے
یوں تو سرائے دل میں وہ ٹھہرا نہ تھا بہت
تحریرِ وقت پڑھنے میں صدیاں گزر گئیں
حالاں کہ لکھنے والے نے لکھا نہ تھا بہت
ہر زاویے سے اپنے مقدر میں دھوپ تھی
سورج نے یوں تو راستہ بدلا نہ تھا بہت
چہروں سے اُڑ چکے ہیں شناسائیوں کے عکس
پہلے میں اِس ہجوم میں تنہا نہ تھا بہت
پھر بھی تمام چپ کی صدا گونجتی رہی
ویرانیوں تو دشتِ تمنا نہ تھا بہت
اختر بجھی بجھی سی رہی فصلِ جستجو
اب کے گلِ طلب ترو تازہ نہ تھا بہت

غزلیں

سَر اُٹھاتی ہوئی ہر لمحہ ضرورت میری
مجھ کو نیلام نہ کر دے کہیں غربت میری
میں نے ہر لمحہ حقارت کی نظر سے دیکھا
زندگی کرتی رہی پھر بھی اطاعت میری
اب جو پھرتا ہے بھرے شہر میں تنہا تنہا
یاد آئے گی بہت اُس کو رفاقت میری
ہر قدم پر نئی دیوار تھی مجبوری کی
پھر بھی قائم رہی دستارِ فضیلت میری
اُس کے چہرے پہ کہیں عکسِ تعلق نہ ملا
میری آنکھوں میں لرزتی رہی حیرت میری
اپنا کھویا ہوا چہرہ میں کہاں سے لاؤں
آئینہ مجھ سے طلب کرتا ہے صورت میری

روشنی سے نم آنکھیں تیرگی سے تر چہرے
دوسروں پہ ہنستے ہیں خود سے بے خبر چہرے
رینگتے ہیں سناٹے عارضِ شکستہ پر
اپنے آپ سے خائف یہ کھنڈر کھنڈر چہرے
اس گھنے دھندلکے میں کون کس کو پہچانے
اور کچھ دنوں روئیں اپنے حال پر چہرے
بے نمک تو تھے لیکن اِس قدر نہ تھے یعنی
جیسے آج نکلے ہوں قید کاٹ کر چہرے
لہر لہر اُمیدیں موج موج مایوسی
ڈوبتے اُبھرتے ہیں بات بات پر چہرے
کس اُمید پر آخر اپنے آپ کو دیکھیں
آئینے تو مِل جائیں دوستو مگر چہرے

سلطان اختر

غزلیں

وہ جس کے چہرے پہ خوش فہمیوں کا غازہ ہے
مرے خلوص کو کیا آئینہ دکھاتا ہے
ہمارے ٹوٹے ہوئے پر اُسی کے کام آئے
بُلندیوں سے جو منظر نئے دکھاتا ہے
کچھ ایسے کھوئے گئے ہیں کہ بھول بیٹھے ہم
طلسم ذات کے باہر بھی ایک دُنیا ہے!
اُفق میں اُڑتے ہوئے دُور تک پرندے ہیں
سُنہری کرنوں کا ہر سمت جال پھیلا ہے
اسی نگاہ میں چمکے ہیں صبح کے تارے!
اسی نگاہ میں پھیلا ہوا دھند لکا ہے
صحیح! لوگ ہیں نا قدرِ ناشناس بہت
غلط! کہ عرضِ ہنر صرف اک تماشا ہے
ہوئی جو شام تو یادوں کے قافلے ٹھہرے
شمیم! ذہن میں جیسے الاؤ سُلگا ہے

مختار شمیم

نہ اختیار کی کلیاں نہ اِعتبار کے پھُول
وہ دے گیا ہے مجھے صرف انتظار کے پھُول
بہت طویل مسافت سے سابقہ تھا جسے
بَدن پہ اُس کے تھے بکھرے ہوئے غبار کے پھُول
ہوائے زرد اُڑا لے گئی سبھی موسم
خزاں کی دُھول نہ دامن میں ہیں بہار کے پھُول
شکست و ریخت سے بھرپور زندگی کے لئے
لطیف طنز ہیں ٹوٹے ہوئے مزار کے پھُول
سُنی ہیں سنگِ ملامت کی دستکیں ہر روز
کبھی تو کوئی بڑھاتا مجھے پکار کے پھُول
مرے دیار کی نیرنگیوں کا کیا کہنا!
شرر ہیں، آگ ہیں، شعلے ہیں اس دیار کے پھُول
نہ ختم ہوتی ہے خوشبو نہ رنگ اُڑتا ہے
سدا بہار ہیں فرحتؔ فرازِ دار کے پھُول

فرحت قادری

ٹھہرے ذرا جو درد تو اس کو شفا کہیں
اک زہرِ جانگداز کو کب تک دوا کہیں
ماضی کی دھوپ چھاؤں بھی اچھی نہ تھی مگر
سورج وہ سر پہ اب ہے کہ روزِ جزا کہیں
اس کاروبارِ عقل سے گھبرا گیا ہے جی
کوئی سُنے تو دل کا بھی کچھ ماجرا کہیں
غم کا کوئی قصور نہ خوشیوں کا جرم ہے
وہ زندگی ملی ہے کہ جس کو سزا کہیں
مدّت کے بعد آئے ہیں پھر تیرے شہر میں
کچھ یاد ہو تجھے تو اِسے ہم وفا کہیں
تکمیلِ آرزو سے بھی ہوتا ہے غم کبھی
ایسی دُعا نہ مانگ جسے بد دُعا کہیں
قربت میں دوریوں کی یہ بے نام کاوشیں
ہم اجنبی کہیں کہ تجھے آشنا کہیں
راس آ گئی ہیں عشق کو حرماں نصیبیاں
جب دل ہی بجھ گیا ہو تو کیا مُدّعا کہیں
کہتے ہیں لوگ یہ کہ عقیدے نہیں رہے
ہم کو ملے وہ بُت بھی تو شانِ خدا کہیں
تمیزِ نیک و بد نہیں آسان اِن دنوں
بہتر یہی ہے اب نہ کسی کو بُرا کہیں
قدرِ متاعِ شعر ہی گم ہو گئی سحرؔ
اس ذات و کائنات کے جھگڑے کو کیا کہیں

ڈاکٹر ابو محمد سحر

ہر چہرہ اک کتاب کی صورت پڑھا کرو
انسانیت کے درد سے دل آشنا کرو
نظروں کی گفتگو بھی سمجھنا ضرور ہے
خاموشیوں کا شور بھی اکثر سُنا کرو
درد اور کچھ سوا ہو بڑھے سوزِ غم کچھ اور
اے چارہ ساز و میرے لئے یہ دُعا کرو
حفظِ خودی کا عشق کو ہے اس طرف لحاظ
کہتی ہے وہ نگاہ کوئی التجا کرو!
جذبات پر تقیدِ عقل اور اس قدر
معصوم دل پہ ظلم نہ اتنا کیا کرو

سیّدہ فرحت

غزلیں

سورج سے چاندنی کا طلب گار میں ہی تھا
الزام کس کو دوں کہ گنہ گار میں ہی تھا
تیشہ اٹھایا ہاتھ میں تو بھید یہ کھلا
خود اپنی رہ گزار میں دیوار میں ہی تھا
جب رات تھی تو چاروں طرف انقلاب تھا
سورج اگا تو تنہا سرِ دار میں ہی تھا
جنگل کی شانتی میں بھی جی تھا اداس اداس
شہروں کی بھیڑ بھاڑ سے بیزار میں ہی تھا
پھر یہ ہوا کہ میری زباں کاٹ لی گئی
خورشیدؔ اپنے شہر کا اخبار میں ہی تھا

عالم خورشیدؔ

زخم رسوائی کے بھی تیری جبیں پر آئیں گے
گھر میں ہو بیری تو ظاہر ہے کہ پتھر آئیں گے
چشم حیراں ہو گا تو گر جائیں گے ہاتھوں سے تیر
اوڑھ کر ہم لوگ جب زخموں کے چادر آئیں گے
ریت کے ٹیلہ پہ بیٹھی منتظر ہے تشنگی
کب ہوا کے دوش پر کالے سمندر آئیں گے
خواب کے دریاؤں سے ابھریں گی جب آنکھیں تیری
سامنے چلتے ہوئے شہروں کے منظر آئیں گے
واپسی کا پھر کوئی امکان باقی نہ رہے
کشتیاں ہم اپنی ساحل پر جلا کر آئیں گے
شعلہ بار آنکھیں میں اس کی بھول بھی جاؤں اگر
پھول سے رخسار تو خوابوں میں اکثر آئیں گے

جمیل قریشیؔ

ہے یہ سال رواں دیکھنا دیکھنا
کوہ آتش فشاں دیکھنا دیکھنا

حال اپنا یہاں دیکھنا دیکھنا
سائباں نہ مکاں دیکھنا دیکھنا

کور چشموں ہماری نظر چاہیئے
پھر پسِ آسماں دیکھنا دیکھنا

وقت شدا دتھا وقت نمرود تھا
مٹ چکے ہیں نشاں دیکھنا دیکھنا

آیا پت جھڑ کا موسم سنبھل جائیے
مسکرائی خزاں دیکھنا دیکھنا

میرے احساس کا میرے جذبات کا
چل پڑا کارواں دیکھنا دیکھنا

میرے اشعار شعلہ صفت تو نہیں
اٹھ رہا ہے دھواں دیکھنا دیکھنا

کھیلنا توڑنا آپ کا مشغلہ
اور دلِ ناتواں دیکھنا دیکھنا

کس تلاطم سے الجھے ہیں انصارؔ ہم
الحفیظ الاماں دیکھنا دیکھنا

قاضی انصارؔ

چھاؤں میں بیٹھے ہوئے جھلسے زیادہ
مسئلے گھر میں ہیں کابل سے زیادہ
بوئے گل ٹھیری کہاں گل سے زیادہ
ہم نے جانا ہے تجاہل سے زیادہ
ایک حرفِ نارسا اور کچھ نہیں ہے
بیچ میں ٹوٹے ہوئے پل سے زیادہ
اب کھلا ہم پر نہیں ہے مول اپنا
اک ترے حرفِ تامل سے زیادہ
راستہ سب کچھ نہیں منزل بھی تو ہے
جزو میں لذت نہ لے کل سے زیادہ
کب ہیں سر گرداں بدن کے واسطے ہم
مل ہی جاتا ہے توکل سے زیادہ
اہمیت ہے خیرؔ انداز نظر کی
شعر میں رنگِ تغزل سے زیادہ

رؤوف خیرؔ

دعا تو صرف دعا تھی دعا کو کیا کہیئے
مگر خدا تو خدا تھا خدا کو کیا کہیئے
مری ہنسی میں بھی وحشت سما گئی آخر!
تمہارے شہر کی آب و ہوا کو کیا کہیئے
فلک پہ رہ کے بھی آدم گناہ کر بیٹھا
اب اس کے بعد کسی پارسا کو کیا کہیئے
سبک سری ہے کہاں اور کہاں مزاج اپنا
خدا سے کچھ نہ کہا ناخدا سے کیا کہیئے
کہاں سے آئی کہاں جائے گی خدا جانے
یہ زندگی تو ہوا ہے ہوا کو کیا کہیئے
ہمارے ہاتھ کا تیشہ نہ چھین لے تعبیر
قرار خواب میں حاجت روا کو کیا کہیئے

شبیر احمد قرارؔ

غزلیں

خود اپنے خون کا پیاسا دکھائی دیتا ہے
ہر یک شخص درندہ دکھائی دیتا ہے
عجیب قہر کا منظر ہے ہر طرف یعنی
جو شخص زندہ ہے مردہ دکھائی دیتا ہے
گلہ کروں تو کیا آئینۂ حیات سے جب
خود اپنا چہرہ ہی دھندلا دکھائی دیتا ہے
جو شخص دوستو اونچی اڑان بھرتا تھا
وہ پر شکستہ پرندہ دکھائی دیتا ہے
ہر ایک آنکھ میں بیچینیاں ہیں خیمہ زن
ہر ایک جسم شکستہ دکھائی دیتا ہے
ہمارے ہاتھ میں اخبار تو بیا ہے مگر
ہر ایک حرف پرانا دکھائی دیتا ہے
ہمارے دور کی میزان کا کرشمہ ہے
کہ ہم کو کانچ بھی ہیرا دکھائی دیتا ہے
عجب طلسم ہے آنکھوں کے روبرو اے بھرتؔ
نظر کے سامنے کیا کیا دکھائی دیتا ہے

بھرت جی

صبر نے بے تاب کیا شمع کو پروانے کو
اب وہی آگ جلا ڈالے گی دیوانے کو
دار کو چوم لیں، قاتل سے گلے لگ جائیں
کس طرح پیش کریں جان کے نذرانے کو
اب کسی شہر میں جانے سے کوئی فرق نہیں
کوئی پوچھے ہے نہ اپنے کو نہ بیگانے کو
کسی دیوار سے ٹکرائیں کوئی بت توڑیں
وحشتِ دل کو کھلونا تو دیں بہلانے کو
ایک مانوس سی خوشبو ہے جو ہر شام ڈھلے
ہم کو دیتی ہے صدا لوٹ کے گھر آنے کو
علمیؔ کیا روئیں اسے جس کا یہاں کوئی نہیں
آؤ اب لوٹ چلو پھر اسی ویرانے کو

انعام الحق علمیؔ۔ نائیجیریا

دیواروں پر ہلتے سائے
اک دوجے سے ملتے سائے
جسم کے خول سے باہر آکر
ساری رات ٹہلتے سائے
گھر سے جب میں باہر نکلوں
مجھ سے قبل نکلتے سائے
رفتہ رفتہ موم کے جیسے
جلتی رات پگھلتے سائے
آنکھ ذرا جو موندی ہم نے
دیکھے لاکھ مچلتے سائے
ایسے بھی کچھ دیکھے ہم نے
جیسے آگ اگلتے سائے
شمسؔ میاں اب کیا سوچا ہے
تم سے آگے چلتے سائے

شمس تبریزی

شبِ فراق اٹھائیں صعوبتیں کیسی
کسی کی یاد نے دی ہیں اذیتیں کیسی
وفا شعاریاں اپنی اساسِ الفت ہیں
پھر اس کے جور و ستم کی شکایتیں کیسی
بیاضِ درد میں غم کی وہ داستاں ہے رقم
تمہارے عشق میں گزری ہیں ساعتیں کیسی
رہِ طلب میں بڑھے جا قدم قدم رہرو
حصولِ منزلِ مقصد میں کاہلیں کیسی
وہ لفظ لفظ میں پوشیدہ طنز کے نشتر
یہ بات بات میں لب پر محبتیں کیسی
لہو کے اشک، خلش، انتظار، بے تابی
ترے فراق میں حاصل ہیں نعمتیں کیسی
کہیں گلاب، کہیں نسترن کہیں ریحان
فروغِ حسنِ نظر کی ہیں صورتیں کیسی
ملی نسیمِ بہارِ چمن کو تیری ادا
خرامِ ناز میں دیکھیں لطافتیں کیسی
جو پاسباں تھے چمن کے وہی ہیں غارتگر
یہ ہم نے سونپ دیں ان کو کفالتیں کیسی
جنوں نواز بہاروں کا خیر مقدم ہے
لہو میں ناچ رہی ہیں یہ وحشتیں کیسی
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ خلوص و مہر بسنتؔ
معاشرے پہ ہیں غالب کدورتیں کیسی

بی ایل بسنت

میری کیا اوقات ساری خلق ہی مجبور ہے
جو مشیت کی رضا ہو وہ مجھے منظور ہے
چار دن کی زندگی ہے اور وہ بھی مستعار
پھر خدا معلوم انساں کس لئے مغرور ہے
اس کے وعدوں پہ جئے جانے کی پائی یہ سزا
دل سبھی دکھ درد سہنے کے لئے مجبور ہے
ہو گئی معدوم چہرے کی بشاشت کس لئے
قتل کر کے میرا قاتل کس لئے رنجور ہے
انگنت ٹکڑوں میں یا تو بٹ گیا چہرا مرا
یا تمہارے ہاتھ کا آئینہ چکنا چور ہے
زیست جب بارِ گراں ٹھہری تھی اے تابشؔ تو پھر
اس کے چھن جانے سے انساں کس لئے رنجور ہے

طلحہ تابشؔ

افسانہ

آگ

محمد طارق

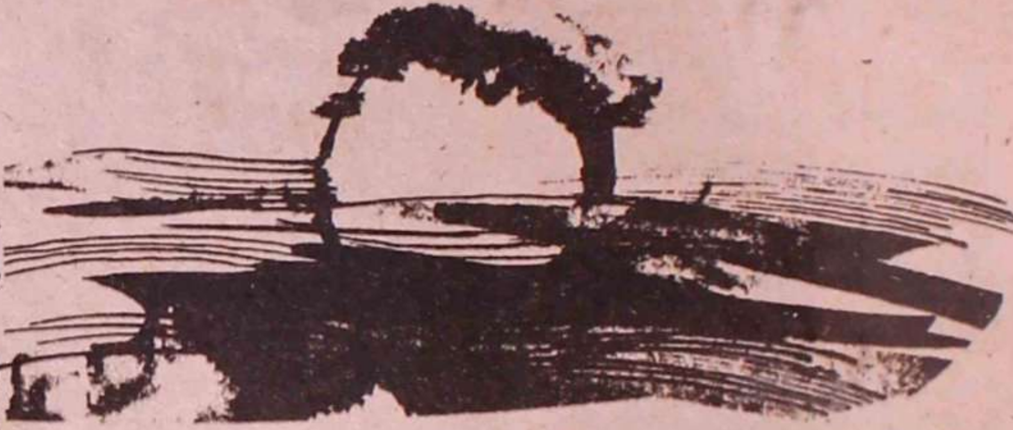

میرے گھر کو آگ لگ گئی۔ نامعلوم کیسے لگی، میں نہیں جانتا میں سویا ہوا تھا۔ ابھی کچھ لمحے ہی تو گزرے تھے میری آنکھ لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سونے سے قبل میں نے چولھے کی آگ کو بجھا دیا تھا۔ خوب پانی چھڑک دیا تھا۔ چراغ روشن تھا صرف۔ مگر چراغ سے میرے پھونس کے جھونپڑے میں آگ نہیں لگی۔ مجھے پکا یقین ہے۔

نامعلوم کس دل جلے نے اپنے دل کی آگ میرے جھونپڑے میں لگادی ——— آپ ہی آپ تو نہیں لگ سکتی ایسی آگ!

میں سوچ رہا تھا۔ میں کس کا نام لوں؟!

میرے تمام پڑوسی تو شریف اور مہذب لوگ ہیں۔ یہ کسی کمینے، کم ظرف کی ہی بدمعاشی ہو سکتی ہے۔ مگر کمینہ کون؟ کم ظرف کون؟

مجھے تو کوئی نظر نہیں آتا۔ تمام شریف، با اخلاق، مہذب نظر آتے ہیں۔ کوئی دشمن بھی نہیں میرا۔ برسوں سے میں اس بستی میں رہ رہا ہوں۔ مگر کسی نے میری طرف ترچھی نظر سے بھی نہیں دیکھا.... مجھے یاد نہیں آرہا ہے میں نے ہم وطنوں کی نظروں کو پرکھا ہی کب، مجھے ضرورت بھی ایسی پیش نہیں آئی۔ بہرحال تمام پڑوسی با اخلاق۔

پھر یہ آگ؟!

بس آنکھ لگنے کی ہی دیر تھی کہ جھونپڑے کو شعلوں نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔...

میں ہڑبڑا کر اُٹھا تھا۔ اور جھونپڑے کے باہر نکل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور چیخنے لگا تھا۔

"آگ لگ گئی، آؤ.... آؤ میرے بھائیو، میرے گھر کی آگ بجھانے آؤ۔"

کچھ ہی دیر میں میرے تمام پڑوسی اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ مگر یہ کیا! اُن کے ہاتھوں میں بالٹیاں نہیں تھیں۔ چراغ تھے۔ بُجھے ہوئے دیئے۔ وہ میرے جھونپڑے کی آگ سے اپنے چراغ جلانے لگے، اپنے گھروں کی تاریکی دُور کرنے کے لئے۔....

چراغ جلا کر وہ چل دیئے، اور میں چیختا ہی رہ گیا، چراغ مت سُلگاؤ بھائیو، پانی سے بجھا دو اس آگ کو!

مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی میں کیا دیکھتا ہوں، میرے پڑوسیوں کے مکانوں کی چھت سے شعلے نکل رہے ہیں۔

وہ تمام گھبرائے گھبرائے اپنے اپنے گھروں سے نکلے وحشت اُن پر سوار تھی۔ وہ میری طرف بڑھنے لگے چیختے ہوئے۔

"ہم تجھے نہیں بخشیں گے۔ تیرے گھر کی آگ سے ہمارے گھر جلے ہیں۔ ہم تجھے بھی جلا ڈالیں گے!!"

وہ میرے قریب آنے لگے۔

وہ اب انسان نہیں تھے۔ اپنے جلتے ہوئے گھروں کے شعلے تھے۔ اُن شعلوں نے مجھے گھیر لیا۔....

●●●

بہت سے اچھے افسانے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں صرف اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ ان کی ابتدا اچھی نہیں ہوتی۔ یا پھر شروع کا حصہ اتنا کھنچا چلا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کو اصل قصے کا اور چھور معلوم نہیں ہوتا اور وہ پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے اور پڑھنا چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ وہ افسانہ مجموعی حیثیت سے کامیاب افسانہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی کوئی بہت ہی اچھا افسانہ اس لئے ناکام رہتا ہے کہ اس کا اختتام خراب ہوتا ہے۔ شروع سے افسانہ دلچسپ اور نکھرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اختتام پر ذرا سی چوک سے سارا افسانہ بکھر جاتا ہے اور پڑھنے والے پر کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ کامیاب افسانہ وہی ہے۔ جو پڑھنے والے کو شروع سے آخر تک اپنی طرف متوجہ رکھے اور ختم ہونے پر اپنا اثر چھوڑ جائے۔

سہیل عظیم آبادی

افسانہ

کچھ پوچھ نہ مجبوری

سرسوتی سرن کیف

"ممی آج تو میٹ لاؤ گی نا؟" ریکھا کی آواز آئی۔

شاید لے بھی آتی۔ بیچارے ... روں کو روزانہ تو جلد جلد الٹ پلٹ کی ہوئی سبزی اور تابڑ توڑ سینکی ہوئی روٹیاں کھانے کو ملتی ہیں۔ اس سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا ہے جب صبح ماں اور بیٹی کو کام پر اور بیٹے کو کالج جانے کی جلدی ہو۔ شام کے وقت اتنی تھکن ہو جاتی ہے کہ کبھی کھچڑی ملتی ہے کبھی انڈے کے بھرتے کے ساتھ پراٹھے۔ اتوار ہی کو ڈھنگ کا کھانا مل پاتا ہے، وہ بھی اس دن جب کوئی فنکشن دوپہر کو نہ پڑ جائے۔ لیکن ریکھا کی تجویز میں جو دبی ہوئی ہنسی کی آمیزش تھی اس نے دماغ کو مشتعل کر دیا۔

میں نے غراتے ہوئے کہا "کیوں؟ کہیں سے خزانہ مل گیا ہے کیا؟ میٹ کا نرخ کیا ہے۔ سیدھی طرح دال روٹی کھاؤ ......"

"اور پھر بھو کے گن گاؤ" ہیمنت نے جملہ اپنے ڈھنگ سے پورا کیا۔ میرا اشتعال تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن ریکھا کی شرارت ختم نہ ہوئی۔ بولی "پربھو کے گُن تو روز گاتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا آج ...."

جانتی ہوں چڑیل تو نے کیا سوچا تھا اور کیا کہنا چاہتی ہے۔ پر نکل رہے ہیں تیرے۔ بس چلتا تو اندر جا کر دو تھپڑ لگا تی۔ ساری کھلکھل دھری رہ جاتی۔ قاعدے کی بات تھی کہ میں خاموش رہتی لیکن چوری پکڑی جائے تو عقل بھی ماری جاتی ہے۔ پہلے کی طرح غراتے ہوے میں نے کہا "آج کیا؟"

ریکھا چپ ہو گئی لیکن بات ختم نہ ہوئی۔ ہیمنت مصنوعی معصومیت سے بولا "لیکن ممی آج تو تم نے ہریش انکل کو کھانے پر بلایا ہے؟"

بلایا ہے تو کیا ہوا؟ کیا ان کے کھانے پر سب کچھ لٹا دیں؟ یہاں آئیں گے تو وہی کھائیں گے جو ہم کھاتے ہیں۔"

بچے خاموش ہو گئے لیکن مجھے بہت دیر تک معلوم ہوتا رہا کہ دبی دبی ہنسی کی آوازیں آرہی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک یہی حالت رہی۔ برداشت نہ ہوا تو ریکھا کے کمرے میں گئی تاکہ دونوں کی سرزنش کروں۔ لیکن کمرہ خالی تھا۔ میں نے زور سے آواز دی "ہیمنت۔"

غسل خانے سے ریکھا کی آواز آئی "ہیمنت سبزی لینے گیا ہے۔"

"کب گیا؟"

"پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔"

"لیکن مجھے بتائے بغیر کیوں چلا گیا؟ میں کچھ ...."

"ابھی آرہی ہوں ممی۔ یہاں ٹھیک سے سنائی نہیں دیتا۔"

اس کا مطلب ہے ریکھا بھی پندرہ منٹ سے غسل خانے میں ہے، ورنہ نہا کر نکلنے والی کیوں ہوتی؟ لیکن پھر ابھی تک دبی ہنسی کی آوازیں کیسی آرہی تھیں۔ مجھی کو کچھ ہو گیا ہے کیا؟ واپس اسٹڈی میں آگئی اور کرسی پر بیٹھ کر ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

سر تھامنے کی فرصت بھی کتنی دیر کے لیے ملنی تھی۔ نو بج گئے تھے۔ ہریش نے ساڑھے گیارہ بجے آنے کو کہا تھا تو گیارہ بج کر اکتیس منٹ نہیں ہونے دیں گے۔ معلوم نہیں کچھ لوگوں میں کیا سنک ہوتی ہے کہ اتنی سختی سے وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر آدھ پون گھنٹے دیر میں آئیں تو کیا انھیں کھانا نہیں ملے گا؟ لیکن اپنی جھنجھلاہٹ پر ہنسی آگئی۔ ہریش تو وقت کے ایسے پابند پہلے نہ تھے۔ گیارہ بجے آنے کو کہتے تو سچ فلسفی کی طرح ایک ڈیڑھ بجے آیا کرتے۔ بیس برس پہلے میں نے ہی شرمندہ کر کے، مذاق اڑا کر، ناراض ہو کر غرض کہ ہر ممکن طریقے سے انھیں وقت کا پابند بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں سال ڈیڑھ سال میں اس مہم میں کامیاب بھی ہو گئی۔ کیوں ایسا وقت کا پابند بنایا تھا انھیں؟ میں خود ہی کب ایسی وقت کی پابند تھی؟ راجندر آدھ گھنٹے چیخ، پکارتے تو میرا میک اپ ختم ہوتا اور اس میک اپ کی وجہ سے ہم ہر پکچر میں دس پندرہ منٹ دیر سے پہنچتے۔ ہاں ہریش کے لئے شروع کی ہوئی مہم سے مجھے بھی یہ فائدہ ہوا کہ میں خود وقت کی پابند ہو گئی۔ اس

عادت کی وجہ سے موجودہ ملازمت میں میرا موجودہ ملازمت میں اچھا امپریشن پڑا اور اور میری عزت ہونے لگی۔

لیکن یہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ مجھے ملازمت کرنی پڑے گی۔ راجندر، میرے خاوند، ایگزیکیوٹو انجینئر تھے۔ پاپا کی وکالت میں پہلے جیسی شان تو نہ رہی تھی پھر بھی اچھی خاصی چل رہی تھی۔ کسے خیال تھا کہ مجھے رات دن تگ و دو کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنا پڑے گا۔ دس برس پہلے پاپا کا عدالت سے رکشے میں واپس ہوتے وقت ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ان کی ٹانگ جو ٹوٹی تو کبھی ٹھیک سے نہ جڑی دو بھائی ہیں۔ اگر ایک بھی پاپا کی خواہش کے مطابق وکالت میں آجاتا تو گھر میں کسی بات کی کمی نہ ہوتی لیکن بھائیوں کا یہ حال کہ ایک کو تھیئٹر کی دھن تو دوسرے کو جوے کی لت۔ پاپا اپاہج ہوئے تو بڑے صاحب، جو کسی طرح مرمٹ کر بی۔ اے۔ کر چکے تھے، سب جج کی سفارش سے عدالت میں اہلمد گی جگہ حاصل کرلی تھی لیکن چھوٹے صاحب کو جوے نے اتنی بھی فرصت نہ دی کہ ڈگری لیتے۔ گھر کی حالت خراب ہوئی تو سیلزمین بن گئے لیکن انھوں نے اپنی آمدنی کو اپنے خرچ ہی تک محدود رکھا۔ ہاں، یہ مہربانی کی کہ شادی نہیں کی۔ بھابی چاہتی تھیں کہ ہم لوگ بھی گاہے بگاہے ان کی مدد کیا کریں لیکن پاپا پرانی وضع کے آدمی تھے، انھوں نے بیٹی سے کچھ بھی لینا منظور نہ کیا۔ اس پر بھائی اور بھابی ان کا جھگڑا رہنے لگا اور چار پانچ برس اسی ذہنی خلفشار میں گزار کر دل کی بیماری میں جان دے بیٹھے۔ میری بدقسمتی کہ میں ان کی تعزیت میں بھی شریک نہ ہو سکی۔ کیونکہ یہاں راجندر یرقان کے شکار ہو گئے تھے عمر بھر کی عادت نے انھیں مار ڈالا۔ ڈاکٹر کی ہدایت اور میری منت سماجت کو نظر انداز کر کے چوری چوری منگا کر شراب پی لیتے۔ ایسے میں کونسا علاج کارگر ہونا تھا۔ دو تین مہینے بعد وہ بھی آخری راہ اختیار کر بیٹھے۔

بعد کی کہانی اور بھی غیر دلچسپ ہے۔ راجندر کی موت کے بعد دستور کے مطابق ان کے سارے بڑے آدمیوں نے نظریں پھرالیں۔ پھر ابھی کیوں نہ لیتے؟ ان کی دوستی تو رشوت دے کر کام کروانے تک تھی، اس وقت دوسرے ایگزیکیوٹو انجینئر کی جیب گرم کرتے یا مجھے اور میرے بچوں کو ٹکڑے ڈالتے؟ صرف ایک کمپنی کے منیجر مہربان نکلے۔ انھوں نے مجھے ریسپشنسٹ کی جگہ دے دی۔ وہ بھی قسمت کی بات تھی کیونکہ اسسٹنٹ منیجر صاحب اپنی نوعمر محبوبہ کو اس جگہ رکھنا چاہتے تھے اور پرخاش کی بنا پر منیجر نے ضداً اسے مسترد اور مجھے منتخب کر لیا۔ بعد میں روکھی سوکھی کھا کر ریکھا کو ایم۔ اے۔ کرایا۔ سال بھر سے ریکھا ایک پبلشنگ فرم میں اسسٹنٹ لگ گئی ہے اور ہم لوگوں کے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہو گئے ہیں مکان کی ضرور کوئی دقت نہیں ہوئی کیونکہ راجندر نے جلد ہی موقع دیکھ کر یہ مکان بنوا لیا تھا۔

لیکن یہ تو دوسری ہی کہانی شروع ہو گئی کیا سوچ رہی تھی؟ ہاں، ہریش کی بات تھی۔ ہریش نے پہلی ہی ملاقات میں میری دلچسپی ان میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ اس بات کو بھی لگ بھگ بائیس سال ہونے آئے۔ اس وقت ریکھا چھ مہینے کی تھی اور ہیمنت پیدا نہیں ہوا تھا۔ راجندر ایک دبلے پتلے عینک پوش حضرت کو شام کے وقت گھر لے آئے تھے اور کہا تھا کہ یہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ میں نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ راجندر یار باش آدمی تھے کبھی ہم لوگ کسی کے گھر مدعو ہوتے، کبھی کسی کو اپنے گھر مدعو کرتے۔ لیکن ان صاحب کی بات ہی اور تھی۔ اسکول میں راجندر کے ہم جماعت تھے اور قسمت نے ان بچھڑے دوستوں کو پندرہ سولہ برس بعد ایک بالکل نئے شہر میں ملا دیا تھا جہاں راجندر بجلی کے ایگزیکیوٹو انجینئر مقرر ہوئے تھے اور ہریش اگروال کالج میں فلسفے کے لکچرار۔ فلسفیوں کی عادت کے برخلاف ہریش ہمیشہ مسکراتے رہتے لیکن عین فلسفیانہ انداز میں خاموشی بھی اختیار کیے رہتے۔ راجندر کو ان کا مذاق اڑانے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ میں نے شروع شروع میں راجندر سے کچھ لے دے بھی کی کہ کیوں غریب کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ لیکن نہ معلوم کیوں دو چار مہینوں میں شاید غیر شعوری طور پر میں ان کا مذاق راجندر سے بھی زیادہ اڑانے لگی اور اس معاملے میں اس حد تک بڑھ کر ایک آدھ بار راجندر کو بھی برا معلوم ہوا۔

لیکن ہریش دنیا سے نرالے تھے۔ ہر مذاق پر ان کا جواب ایک تبسم ہوتا۔ ہاں، یہ میں نے ضرور نوٹ کیا کہ راجندر کے ریمارکوں پر وہ ایک مختصر اور نیم جاں تبسم سے کام لیتے اور میں کچھ کہتی تو پہلے پانچ سیکنڈ مجھے باعینک آنکھوں سے گھورتے اور پھر ساڑھے تین انچ کی پائدار سی مسکان بکھیرتے۔ میں کبھی سوچا کرتی کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے ورنہ اس گونگے مجنوں میں ایسی کیا بات ہے کہ میں گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھی رہتی ہوں۔ گھنٹوں؟ ہاں گھنٹوں ہی تو بیٹھی رہتی تھی کیونکہ ہریش اکثر تیسرے پہر آجاتے تھے اور چھ سات بجے تک راجندر کے آنے کا انتظار کرتے رہتے۔

ایک روز میں یکطرفہ گفتگو سے اوب گئی اور بولی "کیوں صاحب، آپ کو تو اس بات سے فرق نہیں پڑتا ہوگا آپ انسانوں سے بات کر رہے ہیں یا مجسموں کے سامنے بیٹھے ہیں!"

ہریش نے پانچ کی بجائے دس سیکنڈ تک مجھے گھورا اور بغیر مسکرائے بولے "ایسا ہوتا تو تمھارے گھر کیوں آیا کرتا، میوزیم میں

نہ جاتا ؟"

"آپ کو کیا فرق پڑتا ہے ؛ شاید غلطی سے میوزیم سمجھ کر یہاں آجاتے ہوں" میں ہنستے ہوئے بولی۔

"نہیں میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں میوزیم کی مورتیوں میں تراش خراش تمھارے جسم سے بہتر ہے لیکن وہ مجسمے تمھاری جیسی حسین آنکھیں کہاں سے لائیں گے ؟"

ہریش ایسے سپاٹ لہجے میں بولے جیسے کسی طالب علم کو فلسفے کا کوئی مسئلہ سمجھا رہے ہوں۔

میں جیسے آسمان سے زمین پر آرہی۔

میں نے پیدائشی طور پر رومانٹک طبیعت پائی تھی۔ میرا خاص مشغلہ رومانی ناول اور نظمیں پڑھنا تھا۔ ماں بننے کے بعد بھی میں نے مہینے میں چار پانچ مرتبہ سینما دیکھنا جاری رکھا تھا۔ میں رومانیت کے ہر پیچ و خم سے واقف تھی لیکن اچانک بغیر کسی تمہید کے اس قسم کے سپاٹ عرض محبت کے لئے تیار نہیں تھی۔ یہ بات نہیں کہ غیر مرد کی محبت کا مجھے تجربہ نہ ہو۔ راجندر کے کئی دوست میرے شکار رہ چکے تھے۔ کچھ شوق سا ہو گیا تھا کہ اپنے شوہر کے دوستوں کو اپنی نگاہوں کا نشانہ بناؤں۔ یہ خیال ضرور رہتا تھا کہ کھیل آنکھوں ہی آنکھوں تک رہنا چاہئے۔ جب تک حضرت عاشق میں عرض تمنا کی جرأت پیدا ہو تب تک میں خوبصورتی سے انھیں دھتا بتا دیتی تھی۔ کئی بار اس بات کو لے کر راجندر اور میں خوب ہنسے بھی تھے۔ لیکن اس وقت تو شکاری کو اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔

میں کچھ دیر تک زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی "آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں"

"نہیں کرنی چاہئیں تو نہیں کروں گا"

ہریش صاحب نے قدرے ہنس کر کہا "کچھ اور باتیں کرو۔ لیکن کیا باتیں کرو گی ؟ میں فلاسفی کے علاوہ کچھ نہیں جانتا، تم سینما کے علاوہ کچھ نہیں جانتیں۔ اور ابھی تک نہ سینما کی فلاسفی نکلی ہے نہ فلاسفی پر کوئی پکچر بنی ہے"

ہریش نے زور سے ہنس کر بات بڑھائی۔ دو سال کی ملاقات میں یہ دوسری بار میں نے انھیں ہنستے دیکھا تھا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ بڑی دیر میں ایک عجیب سا سوال کیا "آپ مسز ہریش کو کبھی یہاں نہیں لائے"

"وہ کسی کو دیکھنے نہیں جاتیں۔ لوگ ہی ان کے پاس آتے ہیں"

"اچھا میں ہی چلوں گی ..... کار نہیں تو رکشا تو آپ کی گلی میں پہنچ جائے گا" دراصل میں واہی تباہی بک رہی تھی۔ مسز ہریش کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ نیم خواندہ دقیانوسی قسم کی عورتیں ہیں۔ ان سے ملنے کی خواہش نہ پہلے تھی نہ اس وقت۔ لیکن کچھ بات کرنی تھی چاہے وہ کتنی ہی اوٹ پٹانگ اور بے تہذیبی کی کیوں نہ ہو۔

ہریش بولے "چلنا۔ لیکن گالیاں کھانے کے لئے بھی تیار رہنا۔ انھیں دماغی عارضہ ہے..... میں ان کا کم سے کم سامنا کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے دوپہر کا وقت باہر گذارتا ہوں، کبھی لائبریری میں کبھی تمھارے گھر"

بات آگے نہ بڑھ سکی۔ بردس کا لڑکا خون میں لت پت دیکھا تو لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا تھا۔ ریکھا ایک اسکوٹر کی چپیٹ میں آگئی تھی۔ ٹھوڑھی کے نیچے سے بھل بھل کر کے خون بہہ رہا تھا۔ وہ رو بھی نہیں رہی تھی تقریباً غشی کی حالت میں تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن ہریش بجلی کی تیزی سے اٹھے انھوں نے ریکھا کے گلے کی ایک رگ دبا کر خون بند کیا اور مجھے تیزی سے ہدایتیں دے کر پٹی بندھوائی۔ راجندر شہر سے باہر تھے، انھیں ٹیلیفون نہ کرنے دیا۔ اسکوٹر کرائے پر لائے اور مجھے اور ریکھا کو ہسپتال پہنچایا۔ ڈاکٹر نے جب ریکھا کو چھٹی دے دی تبھی ہریش نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے دوسری بار سخت تعجب کا سامنا ہوا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی ہریش جیسا ڈھیلا ڈھالا آدمی وقت پڑنے پر اتنی چستی دکھا سکتا ہے۔ راجندر ایسے موقعہ پر بھاگ دوڑ تو بہت دکھاتے لیکن ان کی گھبراہٹ مجھ سے زیادہ ہوتی۔ اور ہریش تھے کہ ایسے اطمینان سے کام کر رہے تھے جیسے اس قسم کے حادثات سے روزانہ دو چار ہوتے۔

گھر واپس آکر میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "کس منھ سے آپ کا شکریہ ادا کروں"

"شٹ اپ" ہریش نے کہا "بچی کی مدد کر کے میں نے کسی پر احسان کیا ہے ؟..... اچھا اب میں چلتا ہوں تم بھی آرام کرو"

"لاحول ولا قوۃ ! کیا عاشقی ہے اور کیا دوستی ہے اور کیا شرافت ہے ! ستیاناس ہو اس فلسفے کا، اچھے خاصے آدمی کو ہونق بنا دیتا ہے۔ تمھاری بیوی بے چاری پاگل نہ ہو جائے تو اور کیا کرے !" میں نے کہنا چاہا لیکن نہ کہہ سکی۔

ہریش کی بیوی کے جنون کی چاہے جو وجہ ہو، مجھ میں جنون کے آثار ضرور پیدا ہو گئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ اپنی طبیعت کے خلاف، اپنے ضمیر اور اپنے استدلال سے لڑ کر کیسے عشق کیا جاتا ہے اس رات کو دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکی حالانکہ سونا بہت ضروری تھا۔ ریکھا اس وقت تو دواؤں کے اثر سے بے ہوش پڑی تھی، دوسرے دن درد کی وجہ سے چیخ پکار کرتی رہی۔ لیکن انسان جہاں اور بہت سی باتوں میں بے بس ہے وہاں نیند کے معاملے میں بھی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں امتحان کے دنوں میں کم بخت بھگانے پر بھی آجاتی تھی اور اب بلانے پر بھی نہیں آتی۔ رات بھر میں

خود کو ملامت کرتی رہی۔ آخر ہریش کس نقطۂ نظر سے پیار کے قابل تھے؟ صحت ماشاء اللہ، مالی حیثیت سبحان اللہ، دماغی کیفیت معاذ اللہ لیکن کیا کیا جائے ع

کر لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔

میں بحرِ محبت میں ساحل کے قریب ہی غوطے لگا رہی تھی کہ ایک اور صدمہ لگا۔ کچھ عرصے کے بعد ہریش نے بتایا کہ ان کا تقرر وکرم یونیورسٹی لکچرار کے عہدے پر ہوگیا ہے کافی خوش نظر آرہے تھے کہہ رہے تھے کہ وہاں صیغہ فلسفہ میں بہت سے لوگ رٹائرمنٹ کے قریب ہیں اور چار پانچ برس ہی میں ریڈر شپ مل جائے گی اور قسمت نے ساتھ دیا تو دس بارہ برس میں ہیڈ ہو جائیں گے۔ میں نے اندر کی آگ دبائی اور مسکرا کر مبارکباد دی۔ غصہ ضرور آرہا تھا کہ عجب پتھریلا آدمی ہے ایک بار تو مفارقت کی پریشانی آنکھوں میں دکھائی دیتی! آخر اس تین چار برس میں میں نے جو اشارے دئے تھے انھیں نہ سمجھنے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن کیا ہوتا ہے؟ پانی میں کنکری پھینکو تو لہریں اٹھیں گی، ریت میں پتھر بھی پھینکو تو کیا ہوگا؟

روانگی کے وقت ریل پر بٹھانے راجندر اور میں دونوں گئے۔ اس وقت تنہا ہی جا رہے تھے، اہل و عیال کو کچھ عرصے کے لیے یہیں چھوڑنا تھا۔ راجندر پان لینے کے لیے گئے تو میں نے آہستہ سے کہا "خط تو بھیجو گے؟"

اس عرصے میں وہ میرے لیے آپ سے تم ہو گئے تھے۔

"کیوں نہیں" اسی سپاٹ لہجے میں مختصر جواب۔

"ہر ہفتے؟"

اب چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ بولے "یہ تو بہت زیادہ ہے۔ ہر مہینے کا وعدہ کروانا چاہو تو کر سکتا ہوں"

جی جل گیا۔ بڑی مہربانی کریں گے اگر ہیں وعدہ کرنے کے لیے درخواست دوں اور آپ منظور فرمائیں۔ شاید کچھ جلی کٹی سناتی لیکن تبھی راجندر پان لے کر آگئے۔ دو منٹ کے بعد ٹرین چھوٹ گئی۔

وعدہ پابندی کے ساتھ پورا ہوا۔ ہر مہینے کی دسویں تاریخ کو وکرم یونیورسٹی سے خط آتا کافی لمبے خطوط ہوتے تھے لیکن اپنا پن کہیں نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کسی نہ کسی مذہبی، یا کلچرل یا ادبی یا سماجی مسئلے پر ایک مقالہ سا چلا آتا تھا ہر مہینے۔ راجندر نے یہ خط کبھی پورے نہ پڑھے۔ ایک تو ہوتے ہی میرے نام تھے پھر اس خشک مغز سوزی کی طاقت راجندر میں تھی ہی کہاں۔ میں ضرور انھیں تین تین چار چار بار پڑھتی تھی اور آخری بار پڑھنے پر محسوس ہوتا تھا کہ یہ خط صرف میرے لیے لکھے گئے ہیں۔ اتنا کافی تھا میرے لیے۔

سات آٹھ برس کے بعد ان کے ایک خط سے دل میں ہیجان سا پیدا ہوا۔ اس میں انھوں نے اطلاع دی تھی کہ ان کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ خط معمول سے کچھ زیادہ لمبا تھا۔ زندگی اور موت کے مسائل پر پوری تھیسس تھی۔ دل میں پیدا ہونے والا ہیجان فلسفے کے طلاطم میں ڈوب گیا۔

ہاں راجندر کی وفات پر ان کا خط لمبا بھی تھا اور غیر فلسفیانہ بھی۔ اس کی ہر سطر سے ان کے دل کی تڑپ ابھر رہی تھی۔ کچھ کچھ ویسا ہی محسوس ہوا جیسا ریکھا کے چوٹ لگنے کے روز ان کے اپنے معمول کے خلاف تیزی طراری دکھانے پر ہوا تھا۔ لیکن اس وقت یہ باتیں کون سوچتا؟ راجندر کی موت نے مجھے بہت نڈھال کر دیا تھا۔

اس کے بعد ان کے خط کافی دیر دیر سے آنے لگے تھے کیونکہ میں جواب دینے میں بہت خشک ہوگئی تھی۔ ہو نہیں گئی تھی، بن گئی تھی۔ پہلے جذباتی خط لکھتی۔ پھر اسے پھاڑ کر پندرہ بیس سطروں کا خشک خط لکھ دیتی۔ اسے ڈاک میں ڈالنے کے بعد پچھتاتی کہ پہلے والا مسودہ ہی کیوں نہ بھیج دیا۔ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا تین چار مہینے میں ایک بار خط و کتابت۔

ڈیڑھ برس پہلے عجیب سی حرکت کر بیٹھی۔ دراصل میں بہت پریشان تھی۔ دفتر میں کچھ ایسی مشکل پڑ گئی تھی کہ ملازمت چھوٹنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ریکھا کا ایم۔ اے۔ فائنل کا سال تھا۔ بغیر ملازمت کے بچوں کی پڑھائی کس طرح چلتی؟ بچوں کے آگے اپنے دل کا غبار نکالنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ انھیں فضول پریشانی ہوتی اور ان کا پڑھائی میں جی نہ لگتا۔ ہریش کو لکھ بیٹھی۔ کافی لمبا خط لکھا، اپنی ساری پریشانی بتائی حالانکہ یہ بھی لکھ دیا کہ مجھے امید ہے کہ ملازمت کا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا' تمھیں صرف دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے لکھا ہے۔

چوتھے پانچویں روز اس خط کا جواب آیا۔ صرف پندرہ بیس سطر، فلسفیانہ بحث کا نام و نشان نہیں۔ آخر میں لکھا تھا "پدما میری عمر پچاس برس کی ہوگئی ہے لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ جس طرح بیس برس پہلے تمھارا نام سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی اسی طرح اب بھی ہو جاتی ہے۔ میں تمھارے کام آنا چاہتا ہوں لیکن کچھ کہو تو، کس طرح کام آؤں۔"

خط پڑھ کر نشہ چڑھ گیا۔ دفتر کی چھٹی تھی۔ اسی حالت میں سو گئی۔ کھلا خط ہاتھ سے چھوٹ کر پلنگ پر آرہا۔ اسی عرصے میں ریکھا آئی۔ لڑکیوں کو ویسے بھی سراغ رسانی کا شوق ہوتا ہے۔ اس نے چپکے سے خط پڑھا اور اسے جیسے کا تیسا چھوڑ کر دبے پاؤں چلی گئی۔ لیکن اسی روز سے ہریش کا نام آنے پر اس کے چہرے پر شرارت آمیز تبسم دکھائی دینے لگا۔ اس نے ہیمنت کو بھی اپنا ہمراز کر لیا۔ تیس برس پہلے کی بات ہوتی تو ایسی بات

پر جوان بچے ادھیڑ ماں کو کچا چبا جاتے ۔ اِس وقت صرف مذاق اڑایا کرتے ہیں ۔ زیادہ ہمت نہیں ہوتی مجھ سے کھل کر بات کرنے کی۔ لیکن اشاروں کی شرارت کون روک سکتا ہے۔

تین دن پہلے ہریش میرے دفتر میں آئے تھے۔ اس شہر میں فلاسفی کا کانگریس ہو رہی ہے، اسی سلسلے میں آئے ہیں۔ بہت مشغول رہتے ہیں کانگریس میں۔ ایک پیپر بھی پڑھنا تھا۔ میرا مفصل حال پوچھنے لگے۔ میں نے نہ معلوم کس جھونک میں کہہ دیا بہت سے مسئلے ہیں۔ یہاں کیا کیا بتاؤں گی۔ اتوار کو کانگریس کی چھٹی ہے، دوپہر کو کھانے پر آنا تو سب کچھ بتاؤں گی۔"

آج اتوار ہے اور ہریش آ رہے ہیں۔ اب سوال ہے کون سے مسائل انھیں بتاؤں انھوں نے میرے کام آنے کی بات کی تھی، کون سا کام ان سے لوں؟ دیوتا خود ہی منہ مانگا وردان دینے آ رہے ہیں لیکن اب تو وردان ہی سے ڈر لگتا ہے۔ ڈر ہی ڈر ہے ہر طرف۔ غم سے ڈر، خوشی سے ڈر، موت سے ڈر، زندگی سے ڈر۔ میں نے ہریش کے استقبال کی تیاری شروع کر دی۔ کچن کی تیاری تو ریکھا کے سپرد تھی۔ میں نے اپنے کمرے سے پلنگ ہٹا کر باہر ڈال دیا۔ فرش پر مٹ میلے رنگ کی جازم بچھائی۔ دیوار پر راجندر کی بڑے سائز کی تصویر آویزاں کر دی اور اس پر تازہ پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ خود نہانے کے بعد سفید ریشمی ساڑھی پہن لی جیسی ہندو بیواؤں کو پہننی چاہیے۔ ہر طرح اپنے "تحفظ" کی تیاری کر لی۔

ہریش آئے۔ کھانے کے وقت خوب چہل پہل رہی۔ ریکھا اور ہیمنت نے خوب بک بک کی اور خوب قہقہے لگائے۔ کھانے کے بعد دونوں بہلنے سے باہر چلے گئے اور ہریش کو تاکید کر گئے کہ وہ تیسرے پہر چائے پینے سے پہلے واپس نہ جائیں۔ بڑی ہمدردی ہے میرے بچوں کو میرے ساتھ۔

تیسرے پہر تک کا وقت ہم دونوں نے بغیر پلنگ والے بیڈروم میں گذارا۔ ہریش نے راجندر کی تصویر اور اس پر پڑے ہوئے تازہ ہار کو دیکھا اور ان کے ہونٹوں کے گوشوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ بولے "ہاں بھائی اب بولو کیا حال چال ہیں"

"سب ٹھیک ہے" میں اس سے زیادہ کیا کہتی؟ "لیکن مسئلے؟ کن مسئلوں کا ذکر کر رہی تھیں؟" معلوم نہیں اس روز کیا کہہ گئی۔ دراصل کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔"

"اچھا..... ٹھیک ہے۔"

کچھ بیکار کی باتوں میں اور کچھ لمبی خاموشیوں میں دو گھنٹے گذر گئے۔ ریکھا اور ہیمنت واپس آئے۔ چائے بھی ہنسی خوشی کی فضا میں ہوئی چائے پی کر ہریش چلے گئے۔ میں نے پلنگ اندر ڈال لیا اور منہ ڈھک کر لیٹ گئی۔

دن بھر بجلی غائب رہی تھی۔ شاید ریڈیو کھلا رہ گیا تھا۔ شام کو بجلی آئی تو بج اٹھا۔ فراق کی غزل گائی جا رہی تھی۔

اے دوست محبت کی کچھ پوچھ نہ مجبوری
اک ہجر تری قربت اک ہجر تری دوری

افسانہ

خاموشی

قاسم خورشید

جب وہ اپنے سات سالہ پوتے کے ساتھ گاؤں لوٹا تو اس کا گھر راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔

اس بار اس کا پورا پریوار ہولی منانے گاؤں آیا تھا اس لئے بوڑھا بہت خوش تھا ضعیفی اور کمزوری کے باوجود وہ اپنے پوتے کو لے کر ہولی کا سامان خریدنے کی غرض سے شہر چلا گیا تھا۔ واپسی کے وقت اسے ٹرین میں معلوم ہوا کہ بلوائیوں نے اس کی بستی کے اس حصے کو جلا کر راکھ کر دیا ہے جہاں غریبوں کی جھونپڑیاں تھیں۔

اور جیسے ہی اس نے گاؤں میں قدم رکھا اس کے پاؤں کانپنے لگے بھنویں سکڑنے لگیں پھر وہ لاچار و بے بس اپنی جلی ہوئی جھونپڑی کو دیکھ کر آنسوؤں میں ڈوب گیا۔ جب اور آگے بڑھا تو ادھر اُدھر پڑی ہوئی نعشوں کو دیکھ کر زمین پہ لوٹنے لگا۔ بچہ ان نعشوں میں اپنی ماں کو تلاش کر رہا تھا لیکن چہرے اس طرح جھلس گئے تھے کہ وہ کسی کو نہ پہچان سکا۔ اس نے روتے روتے پوچھا۔

ماں ـ ماں "دادا جی ......

بولو ماں کہاں ہے؟"

کوئی جواب دینے سے پہلے ہی بوڑھا بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر بھی بچہ اپنا سوال دہراتا جا رہا تھا۔ اچانک کہیں سے گولی چلنے کی آواز ابھری۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کی کتاب اردو املا اور اس کی اصلاح۔ اردو املا کے وقار اور اردو دوستوں کے اعتماد کی بحالی کے لئے ایک تاریخی اور فکر انگیز دستاویز۔ ڈیمائی سائز۔ صفحات ۹۶ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت ۱۵ روپے۔

راوی شاہنواز
تحریر: احمد منیر

فلمی دنیا کی کہانی۔ شاہنواز کی زبانی

ہم حیدر آباد (دکن) کے رہنے والے ہیں، جہاں میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا۔ والد صاحب حیدر آباد فوج میں میجر تھے۔ وہ اصل میں میرے ماموں تھے، عادل میر۔ ان کے اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے متبنّیٰ بنایا تھا۔ انہی کے پاس میں پلا ہوں۔ ان کی خواہش تھی کہ میں کم از کم گریجوایٹ ہو جاؤں تو وہ مجھے فوج میں اچھی جگہ دلوا دیں گے لیکن پڑھنے پڑھانے میں ہم چور تھے۔ زبردستی کی جسے کہتے ہیں ڈنڈے بازی سے پڑھ لیتا، ورنہ صورت حال یہ تھی کہ ناٹک کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ ناٹک میں کام کرنے کا شوق یوں ہوا کہ سکول میں ہم لوگوں نے ایک ڈرامہ کیا تھا۔ سمرنا فنڈ کے لئے۔ اس میں میرا کردار کامیڈین کا تھا۔ مرتضیٰ شریف اس کے ڈائریکٹر تھے۔ غالباً شکسپیر کے کسی ڈرامے کا اردو ترجمہ تھا۔ ٹھیک یاد نہیں۔ نام بھی یاد نہیں۔ یہ ڈرامہ شہر کے ایک ہال میں ہو رہا تھا۔ شہر میں اس طرح کے کئی ہال تھے۔ اس ڈرامے نے چلنا چلانا کیا تھا۔ اس کا اہتمام کرنے والا ایک سٹوڈنٹ تھا۔ اس بیچارے کا جو پیسہ لگا تھا وہ بھی مارا گیا۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے اس نے بعد میں بھی ڈرامے کئے۔ حالانکہ وہ سستی کا زمانہ تھا۔ پھر بھی وہ اپنا نقصان پورا نہ کر سکا۔ اس کے بعد وہ صاحب میدان سے ہٹ گئے۔

اس زمانے میں فلم بہت کم ہوتی تھی۔ ہندوستانی خاموش فلمیں کوئی خاص مقبول نہیں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر انگریزی خاموش سٹنٹ فلمیں آتی تھیں۔ کم از کم حیدر آباد میں یہی صورت حال تھی۔ ناٹک ہوا کرتے تھے۔

سمرنا فنڈ والے ڈرامے کے بعد یار لوگوں کو جب بھی ڈرامہ کرنے کی ضرورت ہوئی اور فنڈ اکٹھا کرنے کی بات ہوئی۔ وہ سب سے پہلے میرے پاس چلے آتے تھے۔ ڈراموں میں حصہ لینے والے دوسرے لوگ تو پاپولر نہ ہوئے۔ میں بہت مقبول ہوا۔ جس کی وجہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں زیادہ تر کامیڈی رول کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ لوگ ہنستے کیوں ہیں۔ ڈرامے کے ڈائیلاگ کبھی یاد نہیں کرتا تھا بس مطلب سمجھ جاتا تھا۔ اس کے مطابق جو جی میں آتا تھا، بک بک کرتا جاتا تھا۔ اور تالیاں بج جاتی تھیں۔ پھر پردہ گر جاتا۔ اللہ اللہ

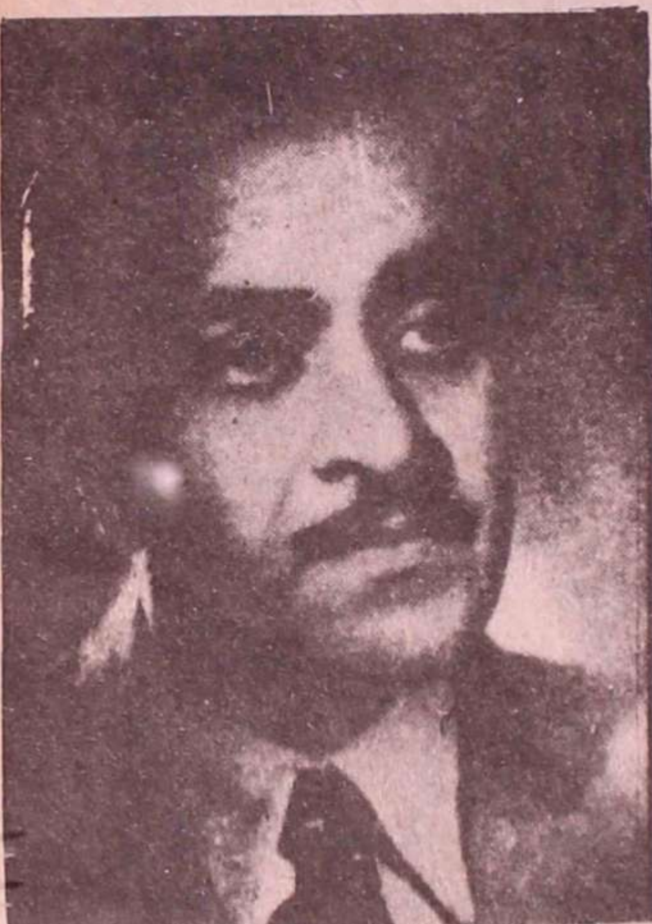

شاہنواز، چالیس برس پہلے

روایت:- شاہنواز تحریر:- احمد منیر

ٹائم خراب کرنا تھا سو کر دیا

آصف اوّل

خیر سلا۔

پھر تو یہ ہوگیا کہ سٹیج پلے کی ریہرسل ہو رہی ہے۔ سٹیج پر کام کر رہے ہیں۔ اس میں آکر تعلیم خراب ہوگئی۔ تعلیم خراب ہونے کے بعد سمجھ لیجیے کہ بھگدڑ مچ گئی۔ والدین نے سوچا کہ اب یہ تو ہاتھ سے جاتا نظر آرہا ہے۔ والد صاحب، وہی ماموں کے ایک دوست جیل کے آئی جی تھے۔ ان کو انہوں نے ایک چٹھی لکھی۔ آئی جی صاحب نے نوکر رکھ لیا۔ یہ نوکری ایسی رہی کہ ہم کوئی کام وام نہیں کرتے تھے۔ ڈیوٹی سے غائب ہی رہے۔ ہم اس قسم کی ایکٹوٹی میں مصروف رہتے تھے کہ کسی کو ستایا جائے۔ کسی کو چھیڑا جائے۔ حسِ مزاح مجھ میں کچھ ضرورت سے زیادہ تھی۔ ہنستا رہتا تھا، ہنساتا رہتا تھا۔ لوگ ہنسانے کے لئے لغویات بکتے ہیں، لیکن میں گالی گلوچ، بیہودہ، ننگے اور فحش قسم کا مذاق پسند نہیں کرتا تھا۔

جیل کی ملازمت کے دوران کبھی ٹھکانے سے نہیں بیٹھا۔ کبھی ایک جگہ نہیں رہا۔ کسی کو چھیڑ دیا۔ کسی کو ستا دیا۔ شکایت ہو جاتی اور میں ٹرانسفر ہو جاتا تھا۔ پھر سوچا کہ اب ملازمت نہیں کروں گا۔ جیل کی نو سالہ ملازمت کے دوران میں ریکارڈ کیپر رہا۔ داروغہ رہا۔ ڈپٹی جیلر رہا۔ میں نے سوچا خود کیوں نہ کوئی کام کروں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ خود کیا کام کرتا۔ کوئی کام آتا ہوتا تو کرتا۔ یار لوگوں نے مشورہ دیا کہ جس چیز سے تمہاری تعلیم خراب ہوئی۔ اس چیز سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن میں نے گولکنڈہ سگریٹ میں نوکری کر لی۔ وہیں حیدر آباد میں، وہ ہمارے عزیزوں کا سگریٹ کا کارخانہ تھا۔ دو تین مہینے بعد یہ بھی چھوڑ دی کہ یہ گڑبڑ والی بات ہے کہ عزیز داری میں، دوستی میں نوکری کرنا مناسب نہیں۔

پھر یہ دھندہ شروع کیا کہ بمبئی سے موٹریں خرید لاتا اور حیدر آباد میں فروخت کر دیتا۔ اس زمانے میں سیکنڈ ہینڈ موٹر (کار) تین سو میں مل جاتی تھی۔ اچھی چالو جسے 'آن روڈ' کہتے ہیں۔ شاندار موٹریں ہوتی تھیں۔ ایک موٹر سو روپیہ منافع پر بک جاتی تھی۔ کبھی پچاس بچ جاتے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی بات تھی۔ تو جناب اس زمانے کی آمدنی کے لحاظ سے ہم سیٹھ تھے۔

بمبئی میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو حیدر آباد میں ہمارے ساتھ سٹیج پر کام کرتے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا تم بیوقوف آدمی ہو۔ آواز تمہاری ماشاءاللہ اچھی ہے۔ اچھے خاصے آدمی ہو۔ تم تو وہ دھندہ کرو جس کی وجہ سے تمہارے کو موٹروں کے دھندے میں آنا پڑا۔ میں نے سوچا مشورہ تو اچھا ہے۔ پہلے بھی یار لوگوں نے یہی مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے پتہ بتایا کہ دادر میں ہریش چندرا آرٹ پروڈکشن کی فلم شروع ہونے والی ہے۔ وہاں چلے جاؤ لیکن کچھ سفارش ہونی چاہیئے۔ میں نے کہا سفارش نہ پہلے میرے کام آئی ہے نہ اب آئے گی۔ ان میں ایک مجید بھی تھا۔ اس نے مجھے ہریش چندرا آرٹ پروڈکشن کا پتہ بتایا۔ لاہور کا تھا۔ بمبئی میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اس نے بھی میرے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا چلو بھائی جس کے نصیب میں ہوگا اسے کام مل جائے گا۔

ہم ہریش چندرا آرٹ پروڈکشن پہنچے تو وہاں ایس ایم یوسف بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پہلی نظر میں ہی مجھ سے متاثر ہوگئے۔ پوچھا تم کہاں تھے، کیا کرتے تھے۔ میں نے بتایا شوقیہ سٹیج پر کام کرتا تھا۔ انہوں نے کہا آپ کو ولن کا رول دیا جاتا ہے۔ ہریش چندرا پروڈکشن کے مالک چندرا راؤ قادم بھی وہاں موجود تھے۔ وہی اس فلم کے ہیرو اور پروڈیوسر تھے۔ ہیروئن مس فیروز تھی۔ ایس ایم یوسف ڈائریکٹر تھے۔ فلم کا نام 'بھارت کا لال' تھا۔ میں نے کہا صاحب وہ دینے لینے کی بات۔ کہنے لگے دینے لینے کی بات یہ ہے کہ شروع میں ہم کسی کو زیادہ دے نہیں سکتے۔ اس لئے آپ کو ۷۵ روپے ملیں گے۔ میں نے کہا مجھے منظور ہے۔ ۷۵ روپے اس زمانے میں بہت ہوتے تھے۔ بعد میں ایک موقعہ پر میں نے کہا کہ ۷۵ روپے بہت کم تنخواہ ہے تو یوسف صاحب کہنے لگے۔ ۷۵ روپے تو میری تنخواہ ہے حالانکہ میں ڈائریکٹر ہوں۔ اس زمانے میں پندرہ ہزار میں پکچر بن جاتی تھی اور ڈھائی تین مہینے میں مکمل ہو جاتی تھی۔ زیادہ ہوا تو چار ماہ لگ گئے۔ اُدھر فلم ختم اِدھر آرٹسٹوں کو چھٹی۔ اس زمانے میں زیادہ تر سٹنٹ فلمیں بنتی تھیں۔ اس لئے آؤٹ ڈور میں ہی کام ہوتا تھا۔ بمبئی میں بہت تیز بارش ہوتی تھی۔ چنانچہ بارش کے زمانے میں بھی چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔

ہاٹ بلڈ عرف 'بھارت کا لعل' ۱۹۳۶ء میں بنی تھی۔ تین مہینے میں فلم مکمل ہوگئی اور ہماری چھٹی۔ یہ فلم کچھ چلی نہیں۔

اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں چندرا راؤ نے 'دولت' کے نام سے ایک اردو فلم اناؤنس کی۔ اس میں بھی وہ خود ہیرو تھے۔ ان کا بھائی ہریش چندرا راؤ بھی تھا، وہ سٹنٹ فلموں کا ہیرو تھا۔ ڈائریکٹر ایس ایم یوسف تھے۔ میں پیراماؤنٹ فلم کمپنی میں ملازم ہوگیا تھا۔ جن لوگوں کے پاس سٹوڈیوز ہوتے تھے۔ وہ پرمانٹ ملازم رکھتے تھے۔ جن کے پاس سٹوڈیوز نہیں ہوتے تھے۔ ان کے یہاں کنٹریکٹ کی بنیاد پر کام ہوتا تھا۔ پیراماؤنٹ میں مستقل ہوتے ہی میری تنخواہ

فلمی دُنیا کے حاجی دراصل کمرشل حاجی ہیں

۱۲۵ روپے ہوگئی۔ اس تنخواہ کو حاصل کرنے والے اپنے کو بہت بڑا آدمی تصور کرتے تھے۔

میری مستقل ملازمت سے ہریش چندرا والوں کو جھجھن سی ہوئی۔ یوسف نے مجھ سے کہا وہ کمپنی تو اچھی نہیں ہے، اس کی پکچر دیکھ رہی بھی تو ٹھیک نہیں ہوگی۔ تم میرے پاس رہو گے تو فائدہ ہوگا میرے پاس تمہارے لئے بہت اچھا رول ہے۔ بہت تگڑا رول ہے۔ تو صاحب میں چلا آیا ان کے پاس۔ ایسا میں نے دوستی یاری میں کیا۔

یہ فلم بھی تین ماہ میں مکمل ہوگئی اور ہم سب بیکار 'دولت' 'بھارت کا لعل' کی نسبت بہت زیادہ چلی۔ پھر صاحب ہریش چندرا راؤ اور یوسف نے مل کر ترکیب کی۔ وہ دونوں واڈیا مووی ٹون میں چلے گئے۔ میں کہیں اور جا کے لگ گیا۔ اس دوران ان دونوں نے پھر مجھے ڈھونڈا اور کہا یار چلے آؤ۔ واڈیا میں بہت چانس ہے میں نے کہا میں جس کمپنی میں کام کر رہا ہوں۔ اس کی فلم ختم ہو رہی ہے۔ ختم ہوجائے تو آجاؤں گا۔

واڈیا میں مجھے 'رنگیلا مزدور' میں ولین کا کردار ملا۔ ڈھائی سو یا تین سو روپے میری تنخواہ تھی۔ 'رنگیلا مزدور' سوشل کاسٹیوم پکچر تھی۔ یہ فلم اچھی چلی۔ فلم مکمل ہوتے ہی میں بھاگ گیا۔ حالانکہ واڈیا والوں نے مجھے کہا بھی کہ پرمانٹ لسٹ پر آجاؤ۔ لیکن میں تیار نہ ہوا۔ یوسف نے مجھ سے کہا کہ ملازمت چھوڑنے کے نتیجے میں تم پریشان ہوجاؤ گے۔ میں نے کہا "گولی مارو میں نہیں رہتا یہاں"۔ وہاں سے چلے آنے کے بعد دو چار دن اِدھر اُدھر ٹہل کے وطن چلے گئے۔

اس دوران انہوں نے ایک اور پکچر شروع کی۔ کیونکہ یوسف اور ہریش چندرا پرمانٹ لسٹ پر تھے۔ پکچر کاسٹیوم تھی۔ سٹوری پر کام شروع ہوا تو مسٹر واڈیا جو مجھ سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے کہا کہ ٹائٹل رول کے لئے شاہنواز ٹھیک رہے گا۔ پورے گروپ نے میری مخالفت کی۔ کیونکہ جب میں واڈیا میں تھا تو ان لوگوں کی سنتا نہیں تھا۔ ان لوگوں نے واڈیا سے کہا کہ اس رول کے لئے فلاں آدمی ٹھیک رہے گا۔ واڈیا نے کہا کہ یہ عجیب لوگ ہیں، میں اونچے آدمی کے لئے کہتا ہوں۔ یہ چھوٹے آدمی کی بات کرتے ہیں۔ وہاں ایک خاں صاحب تھے۔ اس سے واڈیا نے پوچھا، شاہنواز کہاں ہے۔ اس نے کہا "صاحب، وہ تو اپنا ملک گیا ہوا ہے"۔ سیٹھ نے اس سے میرا پتہ مانگا۔ جس بلڈنگ میں میں رہا کرتا تھا۔ خاں صاحب نے اس بلڈنگ کے ہوٹل والے سے میرا پتہ پوچھ کر سیٹھ کو دیدیا۔ سیٹھ نے آرڈر کیا کہ اس پتہ پر شاہنواز کو ٹیلی گرام کرو۔ ان لوگوں نے ٹیلی گرام کی بجائے پوسٹ کارڈ لکھ دیا اور اس میں لکھ دیا صاحب اس کو ٹیلی گرام سمجھیں اور فوراً بمبئی آجائیں۔ مجھے بمبئی آنا تو تھا ہی۔ میں چلا آیا۔

واڈیا نے کہا تم کدھر گیا تھا، میں نے کہا حیدرآباد، کہنے لگا یار پتہ تو دے کر جانا تھا۔ میں نے کہا پتہ دے کر کیا کرتا۔ بولا عجیب آدمی ہو۔ میری پکچر التوا میں پڑی ہوئی ہے۔ چلو شروع ہوجاؤ۔ 'جنگل کنگ' شروع ہو رہی تھی۔ مارا ماری والی فلم تھی۔ فوراً میری شرٹ کا ناپ لیا گیا اور دوسرے لباسوں کی تیاری کا حکم دے دیا گیا۔ کمپنی وہ بہت بڑی تھی۔ چند گھنٹوں میں میری ساری چیزیں تیار ہوگئیں اور شوٹنگ شروع ہوگئی۔

دراصل ٹاکی (بولتی) فلموں کا زمانہ پورے طور پر آچکا تھا۔

اسی لئے وہ لوگ جو خاموش فلموں میں کام کرتے تھے اور ٹاکی میں بول نہیں سکتے تھے، وہ ناکام ہو گئے۔ خاموش فلموں میں اس کی قدر ہوتی تھی جو دوڑنا، بھاگنا، کودنا یا لڑائی مار کٹائی اچھی طرح کر سکتا ہو۔ اب جو زمانہ آیا ٹاکی (بولتی) فلموں کا تو مانگ ہو گئی بولنے والوں کی۔ جو بول سکتا تھا وہ ہو گیا بادشاہ۔ جو بول نہیں سکتا تھا وہ وزیر بھی نہیں۔ بلکہ ایکسٹرا کی لائن میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ میری فلموں میں ایسے لوگ ایکسٹرا میں کھڑے ہونے لگے جو کسی زمانے میں ہیرو ہوا کرتے تھے۔ حالانکہ انھیں ایکسٹرا میں نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ ہیرو رہ چکے تھے۔ انھیں کوئی اور دھندا کر لینا چاہئے تھا۔ مثال کے طور پر ایک صاحب تھے شیراز۔ سٹنٹ فلموں میں ہیرو آیا کرتا تھا۔ اہل زبان نہیں تھا۔ لیکن بول لیتا تھا۔ ٹاکی فلموں میں ایکسٹرا آتا رہا۔ اسی طرح وٹھل تھا۔ وہ اپنے زمانے میں سٹنٹ کنگ تھا۔ اسے انڈین ڈگلس کہتے تھے۔ ٹاکی فلم میں میں نے اس کو ایک معمولی سا رول کرتے دیکھا تو کہا۔ یار تم تو بادشاہ تھے اپنے زمانے کے۔ اس نے کہا کہ وقت گزرتا نہیں تھا، اس لئے یہ کام کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ وقت گزرنے کی یہ یونہی کہہ رہا ہے۔ دراصل یہ کچھ کمانے کی فکر میں آئے ہیں کہ شائد ایک دو پکچروں میں اچھا رول مل جائے۔ لیکن یہ جمے نہیں۔ ایک دو پکچروں کے بعد دکھائی نہیں دیئے۔ میں تو ٹاکی فلموں میں خوب چلا، جم گیا۔ ویلن کا رول کرتا رہا۔

ایس ایم یوسف 'کہاں ہے منزل' بنا رہے تھے۔ انھوں نے کہا یار اس میں رول ایسا ہے کہ تمھارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ رول مہا گورو کا تھا۔ یعنی بدمعاشوں کے گروہ کا۔ بہت اونچا رول تھا۔ اس میں جو بھی سامنے آیا ٹک نہیں سکا تھا۔ زبردست ڈائیلاگ تھے۔ بہت بڑے بڑے سیٹ لگے تھے۔

لیکن یہ فلم کوئی خاص چلی نہیں۔ فلم مکمل ہوئی تو ہماری بھی چھٹی ملی۔

بعد میں پھر چندر راؤ قادم نے پکڑ لیا۔ "آؤ یار پکچر بناتے ہیں۔" میں نے کہا مال کتنا ہے۔ کہنے لگا پندرہ سو روپے۔ میں نے کہا اس سے کا ہے کی پکچر بناؤ گے۔ کہتا ہے، یار کوشش کریں گے تو بس آ جا میرے پاس۔ میں نے کہا آ تو جائیں گے پر کھائیں گے کیا؟ اس نے کہا اسی میں کوشش کریں گے۔ شروع ہو گئے۔ سستے سے سستا ایک سٹل فوٹو گرافر لے لیا۔ دیکھئے اس زمانے میں کیسی فلمیں بنتی تھیں۔ ہم نے اس فوٹو گرافر سے کہا یار دس روپے لے لے اور سٹل فوٹو گرافی کر دے۔ اچھا خاصا فوٹو گرافر تھا۔ کیمرہ اس کا تھا فلم ہم نے ڈالو دی اور سٹوڈیو میں جا کے ایک سیٹ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور مختلف ایکشنوں کے ساتھ تصویریں اتروائیں۔ یہ سیٹ بھی کسی اور کی فلم کا لگا ہوا تھا۔ وہ تصویریں چندر راؤ نے اخبارات کو ریلیز کر دیں اور ساتھ لکھا چندر راؤ کی آنے والی پکچر۔ حالانکہ تھا کچھ بھی نہیں۔ نہ فلم کا وجود تھا نہ کوئی سٹوری تھی۔ میں نے کہا یار یہ کیسی پکچر ہے۔ نہ سٹوری ہے نہ ڈائیلاگ۔ چندر راؤ نے کہا ایسے ہی چلتا ہے۔ تم دیکھو تو سہی کیسی پکچر بنتی ہے۔

ان تصویروں کو پرکاش پکچرز والوں نے دیکھا تو بڑے دہشت زدہ ہوئے کہ یہ تو بڑی زبردست فلم ہو گی۔ خاص طور پر اس میں جو ویلن ہے وہ بہت اونچے قسم کا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے میری تلاش شروع کر دی۔ میں کسی کو اپنا پتہ نہیں بتاتا تھا لیکن ان لوگوں نے ڈھونڈتے ڈھانڈتے آخر مجھے پکڑ لیا۔ جیسے آپ نے آتش فشاں میں انٹرویو کے لئے مجھے ڈھونڈ لیا ہے۔ ایسے ہی انھوں نے پکڑ لیا۔ میں ان کے یہاں پہنچ گیا، اور کہا، کچھ ہے بھی یا خواہ مخواہ کا ڈھونگ ہی ہے۔ ان لوگوں نے میری بڑی آؤ

بھگت کی۔ وہ "سردار" بنا رہے تھے۔ ہیرو جنیت تھا۔ میں نے کام شروع کر دیا۔

اس دوران وہ جو چندر راؤ کی سٹیلس اخبارات میں چھپی تھیں انھیں دیکھ کے پنجاب سے ایک سکھ ڈسٹری بیوٹر آ گیا۔ اسے وہ تصویریں بڑی پسند تھیں۔ ڈنڈے بازی کا زمانہ تھا۔ وہ تصویریں بھی ایسی ہی تھیں۔ سردار جی نے پوچھا، کیا سٹوری ہے۔ سٹوری کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اب ضرورت یہ ہوئی کہ "جنگ آزادی" کی کچھ سٹوری چندر راؤ بنا کے سُنا دے۔ کچھ میں سُنا دوں۔ یونہی بیٹھے بیٹھے ہم نے سردار جی کو سٹوری سُنا دی۔ حالانکہ سٹوری کا وجود ہی نہ تھا۔ پورے پنجاب سرکٹ کا پندرہ ہزار میں سودا ہو گیا۔ پانچ ہزار روپے چندر راؤ کو ایڈوانس مل گیا۔ اسی طرح اس نے کچھ ساؤتھ (جنوبی ہند) سے لے لیا اور پکچر شروع کر دی۔ "سردار" بھی مکمل ہو گئی اور یہ فلم بھی بن گئی اور ہماری پھر چھٹی اور ہم پھر بڑے آدمیوں کی طرح گھومنے لگے۔

شروع سے یہ میری عادت رہی ہے کہ بے کار ہوا تو کسی سٹوڈیو نہیں گیا، لیکن ایک روز میں ہرلش چندر وآرٹ پروڈکشنز گیا تاکہ "جنگ آزادی" کی سٹلیں تو لوں۔ باتوں باتوں میں میں نے چندر راؤ سے کہا۔ وہ تصویریں تو لاؤ البم بنا لیں۔ اتنے میں ہرلش چندرا اور یوسف آ گئے۔ میں ان کے گروپ ورُپ میں نہیں تھا۔ انھوں نے مجھے طنزیں کرنی شروع کیں اتنے میں آغا جانی آ گیا کہتا ہے ارے یار تم یہاں بیٹھے ہو مجھے تمھارے گھر کا پتہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا صاحب کیا تکلیف ہے آپ کو کہنے لگے یار بمبے ٹاکیز

والے تجھے یاد کر رہے ہیں فوراً چل کے ملو۔ اس زمانہ میں چائے کا کپ دو پیسے میں ملتا تھا۔ یہ سُن کر میں نے آغا جانی سے کہا۔ صاحب میری جیب میں اس وقت چار آنے ہیں اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو چائے پلاؤں تو دو پیسے کی چائے آپ پی لیجیے۔ دو پیسے کی چائے میں پی لیتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں آپ کی خاطر نہیں کر سکتا۔ گھر بھی واپس جانا ہے۔ آغا جانی نے کہا نہیں نہیں ایمان سے شاہنواز بھائی میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بمبے ٹاکیز والے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ وہاں میرا کیا کام وہاں تو ایسا آدمی چاہیئے جو پندرہ بیس برس لندن میں، مغربی جرمنی میں رہا ہو یا کم از کم گریجویٹ ہو۔ میں تو صاحب نہ لندن گیا نہ مغربی جرمنی اور نہ گریجوائٹ ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ وہاں میری کیا ضرورت ہے۔ آغا جانی کیوں مجھے مار کھلانے کے چکر میں ہو وہ پھر قسمیں کھانے لگا۔ ایس مکرجی آپ کے انتظار میں ہیں۔

میں نے اسے کہا، یار اس وقت تو میری حالت بھی اچھی نہیں۔ ان دنوں بمبئی میں پاجامہ کوٹ چلتا تھا۔ میں زیادہ تر وہی پہنتا تھا۔ میں نے آغا جانی سے کہا۔ اس بُری حالت میں بمبے ٹاکیز کیسے جاؤں۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ آغا جانی نے بمبے ٹاکیز میں ٹیلی فون کیا۔ اور انھیں بتایا کہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے شاہنواز مل گئے ہیں۔ اب یہاں میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ مکرجی نے جواب دیا انھیں میرے پاس فوراً بھیج دو۔ آغا جانی ٹیلی فون پر ہاتھ رکھ کے مجھے کہتا ہے۔ صاحب تمھارے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے وہی دلیل دی کہ میں اس وقت مناسب لباس میں

نہیں ہوں۔ آغاجانی نے انھیں کہا۔ صاحب وہ کہتا ہے مناسب لباس میں نہیں ہوں، اس وقت کیسے آسکتا ہوں۔ اُدھر سے جواب ملا۔ ہم اس کا ڈریس دیکھنا نہیں مانگتا۔ ہم اُس آدمی کو دیکھنا مانگتا۔

میں نے سوچا بمبے ٹاکیز والے ایسی فلمیں کیوں دیکھتے ہیں کیونکہ جن فلموں میں ہم کام کرتے تھے وہ چھکڑا قسم کی فلمیں تھیں۔ جب کہ ان کا معیار بڑا اونچا تھا۔ سوشل فلمیں بناتے تھے۔ اس سوچ نے مجھے پریشان سا کر دیا۔ تب آغاجانی نے بتایا کہ بمبے ٹاکیز والوں کو ویلن کی ضرورت تھی اور وہ خود چلا گیا۔

ایس مکرجی نے اسے کہا کہ تم ویلن کا کام نہیں کر سکو گے اور نہ ہی تم ویلن دکھائی دو گے۔ کامیڈین سنجیدہ ہو گا تو مزا نہیں آئے گا۔ اس پر آغاجانی نے انہیں کہا تھا۔ صاحب جس قسم کا ویلن آپ لوگوں کو چاہیئے ویسا تو پورے بمبے میں ایک ہی آدمی ہے۔ انہوں نے کہا وہ کون ہے ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ تم اسے جا کے لائے کیوں نہیں۔ یہ واقعہ سنا کے جب آغاجانی نے پھر زور دینا شروع کیا اور ساتھ ہی ایک اور صاحب کہنے لگے۔ تم ضرور جاؤ۔ بہت چانس ہے میں نے کہا، یار میں کیسے جاؤں۔ میرے پاس جانے آنے کا کرایہ ہی نہیں ایک شیرازی صاحب تھے وہاں، وہ بولے۔ یہ میرا پاس آپ لے لیجئے بعد میں واپس کر دیجئے گا جب بخت کی بات ہوتی ہے نا صاحب تو پھر ایسے ہی ذرائع پیدا ہوتے ہیں۔ وہی شیرازی بعد میں کراچی کے ایسٹرن سٹوڈیوز میں لیبارٹری انچارج ہوا۔

۱۹۵۰ء ——— شیخ اقبال، شاہنواز، نجمہ۔ فلم "ہماری بستی" (اردو)

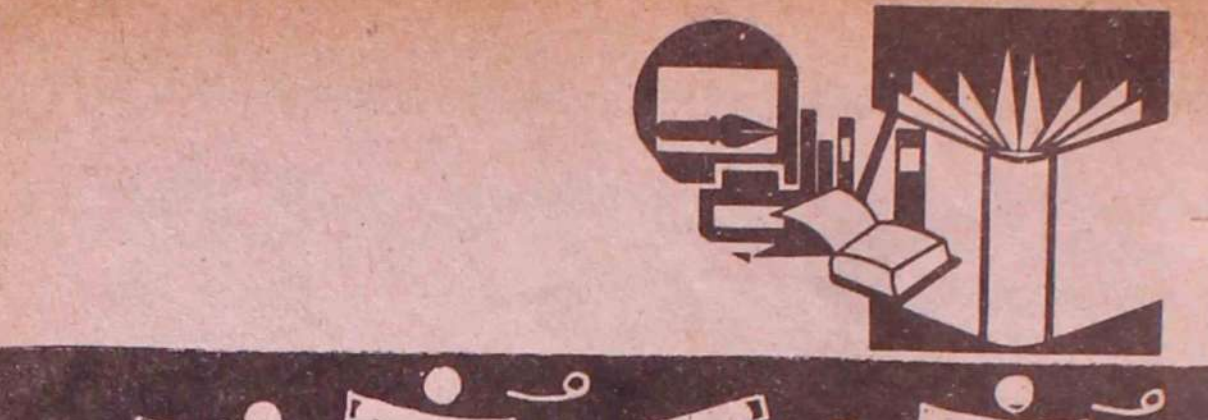

سخن در سخن

خامہ بگوش کے قلم سے

و فیض صاحب، احمد فراز کے رنگ میں شعر کہتے ہیں :

و بینڈ بجانا، نثری نظم لکھنے سے بہتر ہے۔

لیجیے آخر کار فیض صاحب وطن واپس آگئے

؎ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پاکستان فیض صاحب کا گھر ہے اور ہر سیاح اپنے گھر واپس آتا ہی ہے، لیکن ہم اس بات سے بےحد پریشان ہیں کہ اُن لوگوں کا کیا ہوگا جنہوں نے فیض صاحب کی ملک بدری، دربدری اور جلاوطنی کے غم میں اپنی صحت خراب کرلی تھی۔

پریس کلب ہو یا ریس کلب، جہاں چار دانشور مل بیٹھتے تھے یہی مسئلہ زیرِ بحث ہوتا تھا کہ فیض صاحب پر بڑا ظلم ہوا ہے، انہیں ناگفتہ بہ حالات میں وطن چھوڑنا پڑا۔ خود فیض صاحب نے بھی۔ مرے دل مرے مسافر، ہوا پھر سے حکم صادر، کہ وطن بدر ہیں ہم ۔ جیسی باتیں کہہ کر مسئلے کی سنگینی میں اضافہ کیا۔ فیض صاحب کو وطن واپس آنا ہی تھا تو کم از کم اُن لوگوں سے مشورہ کرلیا ہوتا جنہوں نے اُن کی "جلاوطنی" پر نظمیں لکھیں اور نئے نئے مضمونوں کی ہوا باندھی۔ کیا یہ سب نظمیں اور یہ سب مضمون بیکار جائیں گے ؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان تحریروں کو عنوان بدل کے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ " نذرِ فیض " کی بجائے " نذرِ فراز " کردیا جائے کہ آج کل احمد فراز بھی اپنی ملک بدری، دربدری اور جلاوطنی کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔

کئی سال تک ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے فیض صاحب میں خاصی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ایک تبدیلی کا احساس تو اُنہیں خود بھی ہے ۔ ۲۸ نومبر کو وہ لاہور پہنچے تو اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا، "مجھ پر بڑھاپا آگیا ہے"۔ شاعری پر بڑھاپا آنے کی بات ہوتی تو ہم مان لیتے کہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے، لیکن گزشتہ جمعرات کو پریس کلب کے جلسے میں انہیں ہم نے دیکھا تھا، ہمیں تو بڑھاپے کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دیتے بلکہ ہمارے خیال میں تو فیض صاحب اپنے بعض عقیدت مندوں مثلاً مرزا ظفر الحسن اور سیّد سبطِ حسن سے زیادہ جوان نظر آتے ہیں۔

فیض صاحب میں جو سب سے اہم تبدیلی آئی ہے وہ یہ ہے کہ اب اخباروں میں اُن کے بیانات اس طرح چھپتے ہیں جیسے یہ کسی سیاسی لیڈر کے بیانات ہوں۔ بیانات کیا ہوتے ہیں اچھی خاصی گل افشانیٔ گفتار ہوتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فیض صاحب شاعر نہیں، سیاستدان ہیں ہمیں تو کچھ ایسا نظر آرہا ہے کہ اگر یہی عالم رہا تو فیض صاحب پگارا مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے کہ اب یہی واحد سیاسی پارٹی ہے جو جملہ آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ ہے۔

فیض صاحب کی تشریف آوری کی خبر جب ہم نے سنی تو سوچا کیوں نہ اُن کا ایک انٹرویو لے لیا جائے کہ ہمارے اخبار میں شاعروں، ادیبوں کے انٹرویو چھپتے ہی رہتے ہیں ان کی قیام گاہ پر فون کیا تو ان کے میزبان نے کہا، "فیض صاحب بہت معروف ہیں، وہ انٹرویو کے لیے وقت نہیں دے سکتے"۔ ہم نے جب اصرار کیا تو میزبان نے مشورہ دیا کہ آپ فیض صاحب کے بجائے مرزا ظفر الحسن کا انٹرویو کیوں نہیں لے لیتے کہ ان کی زبان بھی فیض ترجمان ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ مرزا صاحب جو کچھ کہیں گے ہمیں معلوم ہے، ہم تو فیض صاحب کے خیالات سے براہِ راست استفادہ کرنا چاہتے ہیں میزبان نے بتایا کہ فیض صاحب ماسکو سے فی الحال خالی ہاتھ آئے ہیں، ان کے خیالات اُن کے دوسرے سامان کے ساتھ بعد میں آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ میزبان کی خواہش نہیں تھی کہ ہم فیض صاحب سے ملیں۔ اس کا ہمیں بےحد افسوس ہوا اور کفِ افسوس ملتے ملتے ہماری آنکھ لگ گئی .... اتنے میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ فیض صاحب ہمارے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہم سوال کر رہے ہیں اور وہ جواب دے رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ گفتگو نوار بند بھی ہوتی جارہی ہے۔ "نوار بند" کی اصطلاح ہم نے ایران کی سیاحت کے دوران سنی تھی۔ ٹیپ پر کسی آواز کو محفوظ کرنا نوار بند کہلاتا ہے۔ "نوار" ٹیپ کو کہتے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو اردو میں " نواڑ " ہوگیا ہے اور " نواڑ " وہی چیز ہے جسے بہادر شاہ ظفر نے اپنے ایک شعر میں اس طرح استعمال کیا ہے :

ہوا ہے کل جو مرا خط پلنگ پہ سے گم
سو بارے آج وہ پایا نواڑ میں سے خط

اس غزل کا مطلع بھی بہت عمدہ ہے :

لکھا جو تیس نے ہم کو اجاڑ میں سے خط
تو کوہکن بھی لکھے گا پہاڑ میں سے خط

معاف کیجیے، جملہ معترضہ بہت طویل ہوگیا۔ ہاں تو فیض صاحب کی جو گفتگو ہم نے نوار بند کی تھی، وہ آپ بھی سن لیجیے :

ہم : بڑی خوشی کی بات ہے کہ بالآخر آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے بڑی زحمت فرمائی۔

وہ : زحمت کی کوئی بات نہیں۔ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں

ہم : کیا اب مستقل قیام پاکستان ہی میں رہے گا۔

وہ : بشرطیکہ اُدھر سے منظوری مل گئی۔

ہم : اُدھر سے ؟

وہ : ہاں بھئی اُدھر سے۔ غالب نے بھی تو کہا تھا۔ کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے۔

ہم : معاف کیجئے گا بات سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ : بھئی ہم شاعر لوگ استعاروں میں بات کرتے ہیں

ہم : یہ استعارہ کیا ہوتا ہے؟

وہ : آپ انٹرویو لینے آئے ہیں یا تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں۔

ہم : اگر دونوں کام ہو جائیں تو اچھا ہے۔

وہ : کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھیئے، وقت ضائع نہ کیجئے۔

ہم : اچھا تو ایک ادبی مسئلہ حل کر دیجئے۔ اس سال افواہ گرم تھی کہ نوبل پرائز آپ کو ملے گا۔ لیکن یہ کسی اور کو مل گیا۔ اس کا سبب کیا ہے؟۔

وہ : سبب ظاہر ہے کہ یہ انعام بعض مصلحتوں کے تحت دیا جاتا ہے۔ خصوصاً ادب اور عالمی امن کے سلسلے میں بڑی دھاندلی ہوئی ہے۔

ہم : آپ کو کون سا انعام مل رہا تھا۔ ادب کا یا عالمی امن کا۔

وہ : اصولاً تو دونوں ملنے چاہیئے تھے خیر کوئی ایک بھی مل جاتا تو ٹھیک تھا۔

ہم : کیا اُمید کی جائے کہ اگلے سال یہ انعام آپ کو ملے گا۔

وہ : اُمید پر تو دنیا قائم ہے۔

ہم : اگر تلافی کے طور پر آپ کو دائٹرز گلڈ کا انعام دیا جائے تو کیا مار رہے گا۔

وہ : نہیں بھئی گلڈ کا انعام ہم نہیں لیں گے۔ اوّل تو رقم بہت کم ہوتی ہے اور پھر اسے بھی متعدد ادیبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

ہم : اس سال اکیڈمی آف لیٹرز بھی انعامات تقسیم کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

وہ : اچھا یہ اکیڈمی انعامات بھی دے گی۔ ہم نے تو سنا تھا کہ یہ ادیبوں کی ڈائریکٹری چھاپنے کے لئے بنائی گئی ہے۔

ہم : یہ اکیڈمی ہر سال ادیبوں کی ایک کانفرنس بھی کرتی ہے۔ اس مہینے یہ کانفرنس پھر ہو رہی ہے کیا آپ اس میں شرکت کریں گے۔

وہ : دعوت ملی تو سوچیں گے

ہم : آپ کو دعوت ضرور ملے گی کیونکہ آپ ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں اور کانفرنس میں اخباری کالم نگار اور مراسلہ نگار تک بلائے جاتے ہیں

وہ : اچھا تو آپ کو معلوم ہے کہ ہم ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔

ہم : جی ہاں "نوٹس"، ہماری نظر سے گزرتا ہے۔ بہت اچھا رسالہ ہے۔ یہ تو فرمائیے کہ کیا پاکستان کے قیام کے دوران بھی آپ اس کے ایڈیٹر رہیں گے۔

وہ : ہاں نگرانی ہماری ہی رہے گی، باقی کام احمد فراز کرے گا۔

ہم : کیا وہ انگریزی کے رسالے کو ایڈٹ کرے گا۔

وہ : جب وہ اُردو میں ہمارے رنگ میں شعر کہہ سکتا ہے تو انگریزی میں ہماری طرح رسالہ کیوں نہیں ایڈٹ کر سکتا۔

ہم : اچھا تو آپ کو معلوم ہے کہ فراز آپ کے رنگِ سخن کو چمکا رہا ہے۔

وہ : یہ تو معلوم نہیں کہ چمکا رہا ہے یا دھندلا رہا ہے لیکن میں نے اسے بار ہا کہا ہے کہ میاں اب تم خاصے سمجھدار ہو گئے ہو، شاعری میں اپنا رنگ پیدا کرو۔ مگر وہ کہتا ہے فیض صاحب اب تو میں اسی رنگ میں کہوں گا، آپ اپنے لئے کوئی اور طرزِ سخن ایجاد کر لیجئے۔

ہم : تو پھر آپ نے کیا سوچا؟

وہ : ابھی تک تو کچھ نہیں سوچا لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا ہے کہ کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا

ہم : وہ واقعہ کیا ہے؟۔

وہ : پچھلے دنوں کینیڈا میں ایک مشاعرہ ہوا تھا فراز بھی وہاں موجود تھا۔ پہلے اُس نے کلام سُنایا اور پھر میں نے۔ سامعین میں سے ایک شخص نے باآواز بلند کہا۔ "فیض صاحب! آپ فراز کے رنگ میں خوب کہتے ہیں"

ہم : شاعری کی بات چلی ہے تو گستاخی معاف، بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اب آپ کی شاعری میں پہلے جیسی بات نہیں رہی۔

وہ : یہ فضول بات ہے۔ میں جیسی شاعری پہلے کرتا تھا، ویسی ہی اب بھی کرتا ہوں۔ وہی مخصوص الفاظ، وہی مترنم بحریں، وہی بے ساختہ قافیے، وہی جھومتی ردیفیں۔ اور کیا چاہتے ہیں آپ؟۔

ہم : ہم اور کچھ نہیں چاہتے، البتہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ نثری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔

وہ : یہ نثری نظم کیا چیز ہے؟

ہم : یہ ایک ادبی صنف ہے جو حال ہی میں ایجاد ہوئی ہے۔

وہ : اچھا تو ہماری عدم موجودگی میں اس قسم کے کام ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایجاد کس ستم ایجاد کی ہے۔

ہم : بہت سے لوگ اس کا موجد ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ آج کل اخباروں میں اس مسئلے پر بڑی گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔

وہ : اس بحث کا کوئی نتیجہ نکلا؟

ہم : جی ہاں خوف کے مارے شاعروں نے نثری نظمیں لکھنی چھوڑ دی ہیں۔

وہ : بھئی یہ نثری نظمیں تو ہم بھی دیکھیں گے۔

ہم : اگر آپ اجازت دیں تو ایک نثری نظم پیش کی جا سکتی ہے۔

وہ : ضرور۔

ہم : جب میں بچہ تھا

روئی کے گالوں سے ڈرتا تھا
اب دشمن کی چالوں سے ڈرتا ہوں
میرے بچپن میں
آگ کے اطراف
دماد ڑ لڑکیاں گیت گاتی تھیں۔
اور اب میں ایک ہوٹل میں
بینڈ بجاتا ہوں
اور لومڑی کی کھال سے
اپنا لباس سیتا ہوں

وہ : آگے چلیئے

ہم : بس نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ نظم کیسی ہے؟۔

وہ : بھئی یہ نظم اپنی سمجھ میں تو نہیں آئی۔ شاعر کو بینڈ بجانے ہی کا کام کرنا چاہیئے۔ نثری نظمیں نہیں لکھنی چاہیئں۔

کتاب اُن کے ہاتھ میں ہی جس کی وہ ورق گردانی کر رہے تھے غور سے دیکھا تو یہ احمد فراز کی نئی کتاب "بے آواز گلی کوچوں میں" تھی۔ موقع کو غنیمت جان کر ہم اُن صاحب کے پاس گئے اور کتاب دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے کتاب ہماری طرف بڑھا دی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ موصوف ہندوستانی شہری ہیں۔ چند روز پہلے لندن سے آئے تھے۔ کراچی میں اپنے عزیزوں سے ملتے ہوئے اب اپنے وطن واپس جا رہے ہیں۔ انہیں اسی جہاز سے دہلی جانا تھا، جس جہاز کے آنے کا ہمیں انتظار تھا اس لئے کتاب کے مطالعے کے لئے ہمیں خاصا وقت مل گیا۔

بشکریہ جسارت

کیا آپ چاہتے ہیں کہ
چنگاری کے ایک ہزار
صفحات آپ کو مفت
دیئے جائیں۔ ؟

و کاغذی ادیب اور کاغذی ادارے:

و ٹی وی کے ادبی پروگرام یا آشوبِ چشم و گوش:

و مسیح الدین صدیقی کا رنگ برنگی جھنڈیوں سے استقبال:

ہمیں یہ تو یاد ہے کہ نظیر صدیقی نے اپنے شعروں کا مجموعہ ایک پمفلٹ کی صورت میں طبع کرایا تھا اور یہ پمفلٹ محکمۂ خاندانی منصوبہ بندی کے شائع کردہ پمفلٹوں کی طرح مفت تقسیم ہوا تھا لیکن ہمیں یہ یاد نہیں کہ نظیر صدیقی کو کسی مشاعرے میں بہ حیثیت شاعر تو کیا بہ حیثیت سامع بھی بلایا گیا ہو۔ وہ تقریباً چھ سال کراچی میں رہے اس دوران میں ہم نے ان میں شاعروں جیسی کوئی بات نہ دیکھی یہاں تک کہ اگر وہ کسی ضرورت سے کسی اور شاعر کا شعر پڑھتے تھے تو اس کی موزونیت کا خیال بھی سننے والا رکھتا تھا لیکن جب سے وہ اسلام آباد گئے ہیں، صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی ہے۔ خدا جانے اسلام آباد کی آب و ہوا میں کیا اثر ہے کہ آدمی نوکری کرنے جاتا ہے اور شاعر بن جاتا ہے۔ نظیر صدیقی بھی وہاں جا کر باقاعدہ شاعر بن گئے اور برسرِ عام شعر سنانے سے انھیں تکلف نہ رہا۔ نوبت یہ ایں جا رسید کہ اب انھیں اسلام آباد کے مضافات ہی میں نہیں، غیر ممالک میں بھی شعر خوانی کے لئے بلایا جانے لگا ہے۔ پچھلے دنوں دوبئی میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں احمد ندیم قاسمی، منیر جعفری، سلیم احمد اور بعض دوسرے نامی گرامی شعراء کے ساتھ نظیر صدیقی کو بھی بلایا گیا۔ انھیں نہ صرف آنے جانے کا کرایہ ملا، بلکہ معاوضے کے طور پر خاصی معقول رقم بھی ملی۔ اس رقم سے انہوں نے دوستوں کے لئے تحفے خریدے۔ ایک خوبصورت قلم انہوں نے ہمیں بھی عنایت کیا۔ آج کا کالم ہم اسی قلم سے لکھ رہے ہیں۔ اس لئے اگر کالم میں بے ربطی نظر آئے تو اسے قلم کے سابقہ مالک کا فیضان سمجھنا چاہیئے بہرحال ہم نظیر صدیقی کی ادبی ترقی پر بے حد خوش ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انھیں آئندہ کینیڈا، انگلستان اور سری لنکا وغیرہ کے مشاعروں میں بھی بلایا جائے اور ہم خوبصورت تحفوں سے مالا مال ہوتے رہیں شاعری کا کیا ہے۔ وہ تو اوروں سے بھی مالا مال ہو سکتی ہے اس کے لئے نظیر صدیقی ہی تو واحد وسیلہ نہیں ہیں۔ دوبئی سے واپسی پر نظیر صدیقی نے کچھ دنوں کے لئے کراچی میں قیام کیا۔ اس مرتبہ انہوں نے پروین شاکر اور محبوب خزاں کی شاعری پر گفتگو کم کی۔ دوبئی کے مشاعرے پر زیادہ بولتے رہے اور یہ بتاتے رہے کہ کس طرح ان کے ایک ایک شعر پر چھتیں اُڑتی رہیں۔ بالآخر شعر کم پڑ گئے لیکن داد میں کمی نہ آئی۔ کراچی کے ادبی حلقوں میں بھی نظیر صدیقی کی آؤ بھگت پہلے کے مقابلے پر زیادہ ہوئی اور وہ اس طرح ہاتھوں ہاتھ لئے گئے جیسے وہ کوئی غیر ملکی مہمان ہوں۔

غیر ملکی مہمان پر یاد آیا کہ گزشتہ ہفتے مولانا امداد صابری دہلی سے تشریف لائے اور چند روز کراچی میں ٹھہرے۔ مولانا صابری بزرگ ادیب ہیں۔ برصغیر کی سیاسی تحریکوں، مذہبی اور سیاسی شخصیتوں اور اردو صحافت پر انہوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ پچھلے ہفتے کراچی کے ایک اخباری کالم میں مولانا کا ذکر تھا۔ انہوں نے یہ کالم پڑھا اور لکھنے والے کا حدود اربعہ پوچھا۔ ہم نے انھیں بتایا کہ عبدالرؤف عروج ایک فرضی نام سے یہ کالم لکھتے ہیں۔ مولانا نے پوچھا۔ وہی عبدالرؤف عروج جنھوں نے "بزمِ غالب" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اور جو مرزا ظفر الحسن کے ادارۂ یادگارِ غالب نے شائع کی ہے"۔ ہم نے اس کی تصدیق کی تو مولانا مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ کو وہی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے مالک رام کی مشہور کتاب "تلامذۂ غالب" اور عروج کی "بزمِ غالب" کا ایک ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام نے عروج صاحب کی کتاب کے مطالب کو اپنی کتاب میں انڈیل دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مالک رام کی کتاب پہلے شائع ہوئی اور عروج کی بعد میں۔ اچھا ہوا کہ عروج صاحب نے کتاب سازی کا کاروبار بند کر دیا اور کالم نگاری کی طرف آ گئے۔ پہلے وہ کالم اپنے نام سے لکھتے تھے اور سندھ کی تاریخ کے واقعات پیر حسام الدین راشدی کی کتابوں سے "اخذ" کرتے تھے۔ اب انہوں نے ایک اور نام سے ادبی کالم نگاری شروع کر رکھی ہے جس میں جولانیٔ طبع کا مظاہرہ وہ اس طرح کرتے ہیں کہ خود بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔

مہمانوں کی بات چلی ہے تو جناب مسیح الدین صدیقی کا تذکرہ بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ گزشتہ ہفتے انہوں نے بھی کراچی کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا۔ اکادمی ادبیات کے ڈائریکٹر جنرل ہونے سے پہلے صدیقی صاحب کراچی ہی میں رہتے تھے، لیکن اہلِ شہر بے خبر تھے اور جب سے وہ اکادمی کے ڈائریکٹر ہوئے ہیں تو اہلِ کراچی حیران ہیں کہ۔۔۔ ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی۔

صدیقی صاحب کراچی آتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی غیر ملکی سربراہ آ گیا ہو۔ بہت سے غرض مند "ادیب" سڑکوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور شبنم رومانی جیسے بے غرض لوگ رنگ برنگی جھنڈیاں لیکر ائیر پورٹ پہنچ جاتے ہیں اب کے بھی صدیقی صاحب کا استقبال اسی شان سے ہوا۔ ظہرانوں، عصرانوں، عشائیوں اور ایک آدھ جلسۂ عام میں شرکت کی۔ کچھ نئے وعدے کئے، کچھ پرانے وعدوں کی تجدید کی اور سب کو خوش کر کے اور خود بھی خوش ہو کر اسلام آباد واپس چلے گئے۔ صدیقی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے ہیں۔

اب کے صدیقی صاحب کے کراچی آنے کا بنیادی سبب راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی کا جلسہ تھا جس میں وہ مہمانِ خصوصی تھے۔ اس جلسے میں صدیقی صاحب کو سوسائٹی کی لائف ممبر شپ پیش کی گئی۔ اکادمی ادبیات کے بعد یہ دوسرا ادارہ ہے جس سے صدیقی صاحب کا زندگی بھر کا تعلق قائم ہوا ہے۔ ہم اس اعزاز پر صدیقی صاحب کو نہیں، راس مسعود سوسائٹی کے کارپردازوں کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے صدیقی صاحب کو سوسائٹی کا لائف ممبر بنا کر خود اپنی سوسائٹی کی لائف میں اضافہ کر لیا ہے۔

صدیقی صاحب نے ادیبوں کے ایک گھریلو اجتماع میں بھی شرکت کی اور اس بات پر زور دیا کہ ادیبوں کو بچوں کے لئے کتابیں لکھنی چاہئیں۔ انہوں نے یقین دلایا کہ اکادمی ادبیات بچوں کے لئے کتابیں لکھنے والے ادیبوں کی مالی امداد بھی کرے گی۔ یہ بیان جس روز اخباروں میں شائع ہوا، اسی دن لاغر مراد آبادی صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ لاغر صاحب نے فرمایا، صدیقی صاحب کے مشورے کے بغیر ہی جو لوگ "بڑوں" کے لئے ادب تخلیق کر رہے ہیں، ان کی اب تک کیا حوصلہ افزائی ہوئی ہے جو اب بچوں کے لئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی پر کمر باندھی جا رہی ہے۔ ہمیں یہ بات پسند نہ آئی اور ہم نے کہا۔ "اکادمی بہت کام کر رہی ہے اور ہم سب کو اس کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیئے"۔ جناب لاغر نے فرمایا "بس منہ نہ کھلوایئے۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ معذوروں کے نام پر کون لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، پاکستان کے ادیبوں کی نمائندگی کرنے کس قسم کے لوگوں کو غیر ممالک بھیجا جاتا ہے۔ کراچی کے کس کاغذی ادارے کو بیس ہزار اور لاہور کے کس کاغذی ادیب کو گیارہ ہزار سالانہ کی رقم مل رہی ہے"۔ ہم نے عرض کیا۔ "کاغذ سے ادب کا تعلق بہت گہرا ہے اس لئے کاغذی اداروں اور کاغذی ادیبوں کی مدد کرنے سے بھی ادب ہی کو فائدہ پہنچے گا"۔

اس کے جواب میں لاغر صاحب نے فرمایا۔ "اکادمی اگر واقعی صحیح کام کر رہی ہے تو اسے اپنی آمدنی اور خرچ کا گوشوارہ شائع کرنا چاہیئے"۔ ہم نے کہا "ابھی تو اکادمی نے ادیبوں کی ڈائریکٹری شائع کی ہے۔ اسی کا اسٹاک ختم نہیں ہوا اور آپ گوشوارۂ آمد و خرچ کی اشاعت چاہتے ہیں"۔ انہوں نے فرمایا۔ "جی ہاں، یہ تجویز ہم اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ عام ادیبوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے نام پر حاصل کی جانے والی رقم کس طرح خرچ کی جا رہی ہے یہ کہاں کی ادب دوستی ہے کہ دس ہزار روپے ماہوار سے زیادہ کمانے والا ایک ایڈیٹر معذوروں کے فنڈ سے وظیفہ لے رہا ہے"۔ ہم نے صفائی پیش کی۔ "معذور ہونے کے لئے کسی کی آمدنی نہیں دیکھی جاتی خرچ دیکھا جاتا ہے۔ آپ جس ایڈیٹر کا حوالہ دے رہے ہیں، ممکن ہے اس کا خرچ گیارہ ہزار روپے ماہوار ہو۔ آخر ایک ہزار کا خسارہ کسی طرح پورا ہونا چاہیئے۔ یہ سن کر لاغر صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ "جی ہاں۔ یہ سب خسارے ہی کا سودا ہے"۔

ہم نے لاغر صاحب کی مسکراہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی اور یہ کہا۔ "اور کیا خبریں ہیں"۔ کہنے

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

ب - ۱

کتابوں کی باتیں

کچھ نئی اور کچھ پرانی مطبوعات

۱۹۸۳ء کی مطبوعات

تردید (شاعری)
محبوب راہی
قیمت: ۲۰ روپے
سائز: ۱۸×۲۲/۸ ڈیمائی
صفحات: ۱۱۲
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ء گولا مارکیٹ دریا گنج - نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

ننھی کتاب (بچوں کی نظمیں)
بدیع الزماں خاور
قیمت: ۶ روپے
سائز: ۱۸×۲۲/۸ ڈیمائی
صفحات: ۴۸
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ء گولا مارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

ترے کوچے سے ہم نکلے (ناول)
عطیہ پروین
قیمت: ۲۵ روپے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن
صفحات: ۳۲۰
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ء گولا مارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

ناظرہ (ناول)
ہاجرہ نازلی
قیمت: ۲۵ روپے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن
صفحات: ۲۴۰
تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ء گولا مارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

عداوت (ناول)
بالا دوبے
قیمت: ۲۵ روپے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن
صفحات: ۱۲۰
موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ء گولا مارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

نگارینہ (ناول)
ثریا محمود ندرت
قیمت: ۲۵ روپے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن
صفحات: ۲۵۶
تقسیم کار: موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹ء گولا مارکیٹ - دریا گنج - نئی دہلی

• • •

خواب زخمی ہیں (ناول)
ثروت ذکی
قیمت: ۲۵ روپے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات: ۲۰۸
ناشر: سیمانت پرکاشن - ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں - دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

شرافت (ناول)
اوشا مالا
قیمت: ۲۵ روپے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات: ۱۹۲
ناشر: سیمانت پرکاشن - ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں - دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

زمیں زاد (ناول)
شاہد پرویز

قیمت: ۲۰ روپے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات: ۱۶۰
ناشر: سیمانت پرکاشن - ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں - دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

پتھر بولتے ہیں (ناول)
مسافر
قیمت: ۲۲ روپے
سائز: ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات: ۱۶۰
ناشر: سیمانت پرکاشن - ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں - دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

زندگی درد ہے دوا بھی ہے (طنز و مزاح)
ہری مہتہ
قیمت: ۳۵ روپے
سائز: ۲۳×۳۶/۱۶
صفحات: ۱۲۸
ناشر: سیمانت پرکاشن - ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں - دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

امیر خسرو اور ہمارا اشتراکی کلچر (ادبی مضامین)
کے - کے - کھلر
قیمت: ۴۰ روپے
سائز: ۲۳×۳۶/۱۶
صفحات: ۱۲۰
ناشر: سیمانت پرکاشن - ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں - دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

اردو ناول کا نگار خانہ (تنقید)
کے - کے - کھلر
قیمت: ۴۰ روپے
سائز: ۲۳×۳۶/۱۶
صفحات: ۱۲۰
ناشر: سیمانت پرکاشن - ۹۲۲ کوچہ روح اللہ
تراہا بہرام خاں - دریا گنج نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

• • •

سے اَبد تک رہیں گے۔ وہ مسائل، راجہ ہریشچندر اور وکرمادیتہ، خلیفہ ہارون رشید، سیزر، جواہر لال نہرو، ہر ایک کے دَور میں رہے ہیں۔ ہر نسل نے اِن کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نسل ختم ہوگئی۔ مسائل ابھی زندہ ہیں اور مسائل امر ہیں۔ فِکر اُن کو حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ صرف اُن کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرواتا ہے اور پھر ایک طرف کھڑا ہو کر دیکھتا ہے کہ کہیں آپ بھی معصومیت سے ان کو حل کرنے کی کوشش میں مُبتلا تو نہیں ہو گئے۔

فِکر کا عقیدہ ہے کہ اُسے خدا نے ہندوستان کے ایسے معاشرے میں پیدا کر کے اُس کے ساتھ مذاق کیا ہے بھونڈا اور بے وقت کا مذاق۔ یہ حرکت خدا کی غلطی تھی۔ اس کے لئے فِکر نے آج تک اُسے معاف نہیں کیا۔ اور کئی صدیوں سے وہ خدا اور اُس کے نظام، اُس کے بنائے ہوئے انسان، اُس کے سماج اور اُس کے مختلف اجارہ داروں کو "ایکسپوز" کر رہا ہے۔ اس کی ہر کتاب ایک نثر نگار کا شکوہ ہے۔ کسی ایک مذہب یا ملّت یا قوم کا شکوہ نہیں، بلکہ انسان کا شکوہ خدا کے خلاف، انسان کا شکوہ سماج کے خلاف۔ لیکن ہم نے سُن رکھا ہے کہ خدا سب کچھ جانتا ہے۔ سب کچھ سمجھتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو فِکر کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا پُنرجنم اس کے بیان کے مطابق اس کی موجودہ گلی یا اپنے ہمسایہ کے گھر نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو یورپ کے کسی نہایت متمول گھرانے میں ہوگا جہاں وہ اپنے پچھلے جنموں کی تلخیاں اور اس جنم کی خرافات سب کو بھول جائے گا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ یہ فِکر کا آخری جنم ہے۔ مصلحتِ ایزدی اسی میں ہوگی کہ اس جنم کے بعد فکر کو مُکتی دے دی جائے۔ نہیں تو خدا کی خدائی اور سماج کی بُنیادوں کو سخت خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

"خس کم جہاں پاک"!

بقیہ سخن در سخن

لگے۔" خبر تو کوئی نہیں البتہ ذوالفقار احمد تابش نے مزے کا ایک مضمون لکھا ہے، وہ پڑھیے۔" لاغر صاحب نے مضمون کا تراشہ ہمارے سامنے رکھا اور خود اُٹھ کر اس انداز سے چلے گئے جیسے کسی غیر ملک میں اکادمی ادبیات کی نمائندگی کرنے جا رہے ہوں۔

تابش صاحب کا مضمون لاہور کے ایک اخبار میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ٹیلیویژن اور ادب" اس میں انہوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ٹیلیویژن والے ادب کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں، وہ اکادمی ادبیات کے سلوک سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ٹی وی کے مشاعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ کراچی پشاور اور راولپنڈی کا حال انہیں معلوم نہیں لاہور ٹی وی کے ..... مشاعروں میں مدعو کئے جانے والے شاعروں کی فہرست کبھی آپ ملاحظہ فرمائیں تو پتہ چلے گا کہ چند مخصوص اور محبوب شعراء گزشتہ کئی سالوں سے ہر مشاعرے میں بلائے اور پڑھوائے جاتے ہیں۔ ان شاعروں کو اہم ترین اور ناگزیر ہونے کی سند کس نے جاری کی اور کیسے جاری کی، یہ راز آج تک کسی پر نہیں کھلا ..... ایک طویل فہرست ان شعراء کی ہے جنہیں آج تک کسی مشاعرے میں مدعو کرنے کے لائق نہیں سمجھا گیا۔ ممکن ہے آپ میرے دعوے پر شک کریں۔ چلئے زیادہ نہ سہی، صفِ اوّل کے چند نام تو میں چلتے چلتے عرض کر دیتا ہوں۔ کیا آپ نے کبھی انجم رومانی، ظہیر کاشمیری، وزیر آغا، عبدالعزیز خالد، سجاد باقر رضوی ..... کو لاہور کے کسی ٹی وی مشاعرے میں دیکھا ہے؟

ذوالفقار احمد تابش نے لاہور ٹی وی کا جو خبرنامہ پیش کیا ہے، وہ خاصا ہولناک ہے۔ ملک کے باقی ٹی وی اسٹیشنوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ایسے ایسے شاعروں کو بلایا اور سنوایا جاتا ہے کہ ناظرین آشوبِ چشم وگوش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا جناب منظر ایوبی نے کراچی کے اُن شعراء کی فہرست تیار کی تھی جنہیں ٹی وی پر کلام سنانے کا موقع کبھی نہیں دیا گیا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ جناب منظر کو ایک دو مشاعروں میں مدعو کر لیا گیا۔ فہرست کے باقی شعراء فہرست ہی میں رہے اور انھیں ٹی وی پر جلوہ گر ہونے کا موقع نہ ملا۔

ٹی وی سے کتابوں پر جو تبصرے ہوتے ہیں، اُن کے بارے میں ذوالفقار احمد تابش فرماتے ہیں۔ "اگر آپ ادب پڑھتے ہیں تو گزشتہ دو سالوں کی چیدہ اور اعلیٰ کتابوں کی فہرست تو بنائیے۔ اور پھر دیکھئے ان میں سے کتنی کتابوں پر ٹی وی سے تبصرے ہوئے۔ چند کتابوں کے نام تو میں آپ کو بتا دیتا ہوں جو میری نظر میں ادب کی آبرو میں اضافہ کرنے کا موجب بنی ہیں۔ باگھ۔ نشیب (عبداللہ حسین) گردِ مہتاب (احمد مشتاق) دوسرا کنارہ (وزیر آغا) ملامتوں کے درمیان (کشور ناہید) جھلکیاں (محمد حسن عسکری) ..... یہ کہئے آپ نے ٹی وی پر ان میں سے کسی کتاب پر تبصرہ دیکھا یا سنا ہے؟"

تابش صاحب خاصے معصوم آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ خود نیشنل بک کونسل کے عہدیدار ہیں، اسی لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی طرح ٹی وی والے بھی معیاری کتابوں سے واقف ہوں گے۔ ٹی وی والوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ کتابوں سے کیا، ادیبوں سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ہم ایک ایسے ٹی وی پروڈیوسر کو جانتے ہیں جو ضیاء نثار احمد سے تو واقف تھا، لیکن ضیاء جالندھری کا نام اُس نے نہیں سُنا تھا۔ جب ہم نے اُسے بتایا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں اور وہ شخص ٹی وی کا ڈائریکٹر جنرل بھی ہے اور ایک مشہور شاعر بھی تو وہ پروڈیوسر حیران ہوا اور کہنے لگا: "اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود صاحب کو شعر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟" ہم نے عرض کیا۔ "ضرورت تو خیر اس عہدے پر فائز ہونے سے پہلے بھی نہیں تھی، اور اب تو انہیں فرصت بھی نہیں ملتی کہ شعر کہہ سکیں، لیکن "سرِ شام" اور "نارسا" کے مصنف کی حیثیت سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس پر پروڈیوسر صاحب نے فرمایا۔ "اچھا تو انہوں نے سرِ شام اور نارسا کے نام سے ٹی وی ڈرامے بھی لکھے ہیں؟"

ٹی وی پروگرام "ماہنامہ" کے بارے میں ذوالفقار احمد تابش کو جو شکایت ہے، وہ یہ ہے ــــ "گنتی کے چند نام ہیں، وہی بار بار اس پروگرام میں تشریف لاتے ہیں یا یوں کہئے کہ انہیں مدعو کیا جاتا ہے .... ان کے علاوہ بھی پڑھے لکھے لوگ شہر میں موجود ہیں۔ شہر ہی میں نہیں گرد و نواح والوں کا بھی حق ہے کہ انہیں بھی کبھی زحمت دی جایا کرے ..... چند نام اس ضمن میں ملاحظہ فرما لیجیے اور دیکھ لیجیے کہ اُن کا ادبی قد و قامت کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر محمد عثمان، عبداللہ قریشی، علی عباس جلال پوری ...."

تابش صاحب نے ناموں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ ہم نے نمونے کے چار نام رہنے دیے ہیں، انہیں سے باقی ناموں کا اندازہ کر لیجیے کہ وہ کتنے اہم ہوں گے۔ حیرت ہے کہ لاہور ٹی وی والے اتنے اہم لوگوں کو اپنے پروگرام "ماہنامہ" میں مدعو نہیں کرتے۔ تابش صاحب اگر پسند فرمائیں تو ان سب حضرات کو کراچی بھجوا دیں۔ ہم انہیں ٹی وی پروگرام دلوانے کی کوشش کریں گے۔ آج کل کراچی میں جس پروڈیوسر کے پاس ماہنامے کا پروگرام ہے۔ اُس کا یہ کہنا ہے کہ کراچی میں ایسے لوگ نہیں ملتے جو اسی پروگرام کے شایانِ شان ہوں۔

بقیہ ایک خط

اس کی کیا ضرورت ہے۔ پاسپورٹ سے اور مذہب سے کیا واسطہ۔ میں نے پوچھا اگر میں اپنا مذہب نہ لکھوں تو پاسپورٹ نہیں ملے گا۔ پتہ چلا ملے گا۔ بس میں نے اس کالم میں "تمام مذاہب" لکھ دیا۔ اب بھی جب کسی فارم میں مذہب کا کالم ہوتا ہے تو بہت جی جلتا ہے۔ سرکار کو میرے یقین کی گنتی سے کیا واسطہ۔

انگریز نے تو یہ کالم اس لئے رکھا تھا کہ یورپ میں اور پھر یہاں ہندوستان میں بھی آپسی پھوٹ ڈالنے کے طریقے نکالنے کے لئے مذہب جاننا ضروری تھا۔ لیکن اپنی سرکار اس سے کیا کام لیتی ہے۔ اب بھی پیدائش کی اطلاع میں، اسکول کالج کے داخلے کے وقت یہ کالم بھرنا پڑتا ہے۔ میرا چھوٹا سا نواسہ جانتا ہے کہ اس کے کانوینٹ میں کون ہندو ہے مسلمان عیسائی اور سکھ ہے۔

کیوں؟

کیا ہماری سرکار بھی فرقہ وارانہ فساد کے ذریعے پھوٹ ڈال کر اور پھر دونوں کے زخموں پر مرہم رکھ کر سرخ روئی حاصل کرنے کے لئے ان مذہبی ڈراموں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اور مختلف پارٹیاں بھی اس تقسیم سے کچھ فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اسی لئے ہر رجسٹر میں مذہب درج ہے۔ مذہب ذہن اور دماغ کی آسودگی کے لئے نہیں سیاسی اور اقتصادی ہتھکنڈوں کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

تب کیوں نہ یقین ہو کہ انگریز کی گدی پر بیٹھنے والے انگریز یا نسہ ہی پھینکتے ہیں ــ ابھی ایک فارم سرکار کی طرف سے بھرنے کو ملا۔ وہی مذہب کا کالم منہ، چڑا رہا تھا۔ جی چاہا پھاڑ کر پھینک دوں یا لکھ دوں کیا ہوگا میرا مذہب معلوم کر کے، کون سی سزا ملے گی یا انعام۔ مجھے دونوں کی ضرورت نہیں جو میرے مذہب کی بنیاد پر ملے۔

راہی پیارے کیا فرق پڑتا ہے جو ہم سوچتے ہیں، کچھ کر نہیں پاتے۔ تمہارا مضمون مختصر ہوتے ہوئے بھی دل کو چھوتا ہے۔ اگر عوام کو جہالت اور توہم سے نکال لیا تو پھر کروڑپتی فٹ پاتھ پر نظر آئے گا۔ یہ مذہب ہی ہے جو کہتا ہے۔ دینے والا اللہ ہے، اپنے پیاروں کو مٹھی کھول کر دیتا ہے۔ اسی لئے کہ زار اور چرچ مل کر عوام کو لوٹتے تھے، انقلاب روس میں سب سے پہلے ان دونوں کا قلع قمع کیا۔ زار کے بعد اگر چرچ رہ جاتا تو خدائی مدد والی شہنشاہیت تو اور بھی خوفناک ہوتی۔ یہ مذہب کی برکت پولینڈ میں کیا رنگ جما رہی ہے۔ پوپ صاحب پولینڈ میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی برکتیں پھیلا رہے ہیں۔

تلک دھاری، معجزہ دکھانے والے پیر اور فینسی ڈریس والے پوپ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے لگتے ہیں۔ عام انسانوں جیسے کپڑوں سے کام نہیں چلتا۔ کیا یہ مکٹ پہننا پوپ کے لئے بہت ضروری ہے۔ کیا خدا صرف عبادت گاہوں میں دھرا ہے دلوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنے یقین کا ثبوت مندر مسجد اور چرچ گوردواروں کی صورت میں دکھانا ضروری ہے۔ اس خدائے ذوالجلال کی عبادت میں زر جاگیر کا بٹوارہ ضروری ہے۔ صوبہ کی جوڑ توڑ اقتصادی اور سیاسی مسئلہ سے خدا کو کیوں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ صوبوں کی منسٹریاں اسمبلی کی سیٹیں اونچے نیچے عہدے مختلف مذاہب کے خداؤں کو بڑی شدت سے چاہئیں۔ یہ سب قوم کی خدمت کے لئے متنگ و دو ہے؟ یہ مذہب ہے۔

اور ہاں یہ جو جائے پیدائش کا بھی کالم ضروری ہوتا ہے تو اس کے پیچھے کون سی پالیسی ہماری بہتری کی پوشیدہ ہے۔ صوبہ پرستی کا زور شور ہے کہیں ایسا تو نہیں جو جہاں پیدا ہوا اسے وہیں جا بسنا ہوگا۔ اپنی تو چھٹی... ہو جائے گی۔ تم کہاں پیدا ہوئے تھے۔ بھئی میں تو یوپی کے سب سے سڑے ہوئے شہر میں پیدا ہوئی تھی۔ نام نہیں بتاؤں گی کہیں نوٹ کر لیا گیا تو؟ انگریز نے تو ملک ہی تقسیم کیا تھا ہمارے رہنماؤں نے چودہ صوبے چودہ زبانیں، چھوٹے چھوٹے چودہ ملک بنا ڈالے، جن کی زبانیں بھی چودہ۔

درمیان قصر دریا تختہ بندم کردئی
باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

بقیہ فکر کا انٹرویو تونسوی سے

فکر صاحب: خدا کے متعلق کچھ ارشاد؟

تونسوی صاحب: ہے اور نہیں کے درمیان ایک سینڈوچ۔

فکر صاحب: کیا آپ کالم نگار ہیں یا طنز نگار؟

تونسوی صاحب: میں کالم نگار ہوں اور آپ طنز نگار۔

فکر صاحب: آپ نے اپنے دو ٹکڑے کیوں کر دیئے؟

تونسوی صاحب: آپ نہیں! ہم نے اپنے دو ٹکڑے کر دیئے۔

فکر صاحب: مجھے تو یہ دوغلا پن لگتا ہے۔

تونسوی صاحب: ادب کی تاریخ میں دوغلے پن کا ہی رواج ملتا ہے۔

فکر صاحب: آج کل جدید ادب کا دور چل رہا ہے۔ کیا یہ آپ کو مضحکہ خیز لگتا ہے۔

تونسوی صاحب: اس کا جواب میں نہیں دوں گا۔ آپ دیجئے۔

فکر صاحب: ہر دور کا ادب جدید ہوتا ہے۔ اس کی شروعات ہمیشہ مضحکہ خیز ہوتی ہے۔

تونسوی صاحب: ادب اور سرکار میں کیا رشتہ ہوتا ہے۔

فکر صاحب: جو درباری اور نواب میں ہوتا ہے۔

تونسوی صاحب: فکر صاحب! ہمارے قارئین کے نام کوئی پیغام دیجئے۔

فکر صاحب: اپنا پیغام ظرافت ہے جہاں تک پہنچے۔

آپ چنگاری پڑھتے ہیں؟ اس کے سالانہ خریدار ہیں؟ اردو میں کوئی دوسرا پندرہ روزہ اس طرح کا ہے۔؟

چالیس ادیبوں کی منتخب مزاحیہ اور طنزیہ تخلیقات پر مشتمل

کالم نگار نمبر

• نہ صرف ڈیڑھ سو سال کی تاریخ، صحافت، اور سماجی و سیاسی نشیب و فراز کی دلچسپ داستان پیش کرتا ہے۔
• بلکہ اُردو زبان کی زبردست قوتِ بیان اور اردو ادیبوں کے جرأت اظہار کی بہترین عکاسی بھی کرتا ہے۔
• فوٹو آفسٹ کی طباعت کے ساتھ تصاویر سے مزین۔

چند فن کار: منشی سجاد حسین۔ رتن ناتھ سرشار۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ خواجہ حسن نظامی۔ حاجی لق لق۔ عبدالمجید سالک۔ ملا رموزی۔ ساگر چند گورکھا۔ چراغ حسن حسرت۔ قاضی عبدالغفار۔ شوکت تھانوی۔ کنہیا لال کپور۔ ابراہیم جلیس۔ تخلص بھوپالی۔

مرتب: فکر تونسوی۔ پانچ سو صفحات۔ قیمت صرف ۱۰۰ روپئے۔ چنگاری کے خریداروں کو خصوصی رعایت۔

چنگاری ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی نمبر ۳۲

چنگاری کے **غزل نمبر** سے پہلے بھی کئی رسائل کے غزل نمبر شائع ہوئے ہیں

• مگر چنگاری کا غزل نمبر ان تمام نمبروں سے مختلف اور منفرد ہوگا۔
• اس نمبر میں کلاسیکی شعرا کی غزلوں کا انتخاب تو ہوگا ہی۔
• مگر اہم ترین حصہ ان غزل گو شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا جو ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک نمایاں ہوئے۔
• اس سے بھی اہم حصہ ان غزل گو شعرا کی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہوگا جو تقسیم ملک کے بعد نمایاں ہوئے۔
• تمام نئے، پرانے غزل گو شعرا کے سوانحی خاکے کے علاوہ ان کی غزل گوئی پر مختصر مضامین ہوں گے۔
• غزل میں کلاسیکی، نئے، جدید اور جدید ترین رجحانات، اور تجربات پر مضامین ہوں گے۔
• غزل کی تاریخ، اس کی اہمیت، اس کے ارتقا، دوسری زبانوں میں اس کی مقبولیت پر مضامین ہوں گے۔
• تمام غزل گو شعرا کی دستیاب اور نایاب تصاویر ہوں گی۔
• یہ نمبر قارئین اور غزل کے شائقین کے لئے تو اہم ہوگا ہی۔
• طلبا کی درسی ضروریات کی بھی تکمیل کرے گا۔
• اگر آپ غزل کہتے ہیں تو اپنی پانچ غزلیں، تصویر اور بایو ڈاٹا ارسال کیجیے۔

پندرہ روزہ چنگاری ۳/۱۴۱۰ رام نگر شاہدرہ دہلی ۳۲

CHINGARI (Fortnightly) 1410/3 Ram Nagar Shahdara Delhi-32
R. N. 36930 80 Regd. No. D (E) 49 Price Rs. 2-00

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت

★ پندرہ روزہ چنگاری ایک ایسا رسالہ ہے جسے خاص و عام دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ اس کے ایک شمارہ کی قیمت ۲ روپے اور زرِ سالانہ ۴۵ روپے ہے۔

★ راجندر سنگھ بیدی نمبر کی قیمت ۶۵ روپے ہے۔

★ سعادت حسن منٹو (ایک نفسیاتی تجزیہ) کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

★ لوکاچ اور مارکسی تنقید مصنفہ اصغر علی انجینیئر، کی قیمت ۳۰ روپے ہے۔

چنگاری، منٹو، بیدی اور لوکاچ کی مجموعی قیمت ۱۷۰ روپے ہوتی ہے۔ اگر آپ ہمیں ۱۲۰ روپے ارسال کر دیں تو بیدی نمبر، منٹو اور لوکاچ آپ کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیج دیا جائے گا اور ایک سال کے لیے چنگاری آپ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔

اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ

اگر آپ پندرہ روزہ چنگاری یا ماہنامہ عصری آگہی کے سالانہ خریدار ہیں تو آپ کو ہر کتاب کی خریداری پر پندرہ سے بیس فیصد کمیشن دیا جائے گا چاہے آپ ہمارے ادارے کی کتاب خریدیں یا ہمارے توسط سے کسی دوسرے ادارے کی کتاب۔

عصری آگہی پبلی کیشنز، ۱۴۱۰/۳ - رام نگر، شاہدرہ دہلی ۳۲